جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ دار المصنفین

(۹۴)

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے

معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپی

قیمت ۲۵ روپے

سنہ ۱۹۷۰ء
سنہ ۱۳۹۰ھ

فہرست مضامین

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پیش لفظ۔ از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	۴	علماء کی قسمیں	۱۲
دیباچہ از مصنف	۵	پاک طینت علماء	۱۴
ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں	۱	درس و تدریس میں مشغول رہنے والے علماء	〃
کی حکومت کی نوعیت		حکمراں طبقہ کے معاون علماء	۲۰
اسلام کا نعرہ	۲	علماء کا اثر سلاطین پر	۲۲
حمیتِ اسلامی کا لحاظ	۳	مغل حکمرانوں کی مذہبیت	۲۵
عجیب ستم ظریفی	۴	مفاد پرست علماء	۲۹
کیا مسلمان حکمراں اسلام کے	۵	جری علماء	۳۰
نمایندے نہ تھے؟		فتنۂ اباحیت	۳۵
کیا بادشاہت غیر اسلامی طرز حکومت ہے؟	۸	فتنۂ مہدویت	۳۶
علماء کے قدم جمنے کا ذریعہ	۱۰	فرقۂ روشنیہ	〃
علماء کا شاندار اجتماع	۱۱	جہانگیری عہد کی بعض مذہبی گمراہیاں	۳۷
عہد [illegible]	〃	شاہجہانی اصلاح	〃

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
فتنۂ فرپودی	۳۷	علماء کے تصنیفی کارنامے	۶۲
سلاطین کے ناقد علماء	۳۸	تقلید جامد کے فوائد	۶۹
شاہانہ تکلفات	۳۹	اس کے نقصانات	۷۰
علماء کی نااتفاقی	۴۳	اس کا روشن پہلو	"
دین الٰہی	۴۴	تمدنی کشمکش	۷۱
علماء کی دار وگیر	۴۵	علماء اور امراء	۸۲
مسلمانوں کی تہذیبی زندگی	"	عہد مغلیہ کے امراء اور علماء	۸۵
احساس برتری	۴۶	شیعہ سنی امراء کا تنازعہ	۹۲
اورنگ زیب کی رواداری	۴۷	مسلمان عوام	۹۵
عبادت گاہوں کا انہدام	۴۸	لائق سلاطین کے عہد میں لائق علماء	۹۹
مسلمان حکمرانوں کا مذہبی تعصب	۵۰	اچھے علماء کا فقدان	۱۰۳
جزیہ	۵۱	بگڑی معاشرت	۱۰۵
تبلیغِ اسلام	۵۲	شاہ ولی اللہؒ کا احسان	۱۰۶
اسلام کی اثرپذیری	۵۳	علماء کی دستگیری	۱۱۰
وحدت روحانی کی سعیِ ناکام	۵۴	شاہ عبدالعزیزؒ	"
دلوں کی تسخیر	۵۵	شاہ اسماعیل شہیدؒ	"
علماء کی تصنیفی رواداری	۵۶	حضرت سید احمد شہید بریلویؒ	"
مسلمانوں کی عام رواداری	۵۹	مشائخ اور سلاطین	۱۱[illegible]

Marfat.com

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
صوفیہ سے عقیدت کے اسباب	۱۱۶	جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانیؒ	۱۲۷
سلاطین پر صوفیہ کے اثرات	۱۱۹	عہد عالمگیر میں حضرت سرمد کی شہادت	۱۸۴
صوفیۂ کرام کی تلقین	۱۱۴	صوفیۂ کرام کی شانِ استغنار	۱۸۸
عدل پرور سلاطین	۱۱۹	اکابر صوفیہ کی اولاد اور ان کی روایت شکنی	۱۹۱
سلاطین کی مدح سرائی	۱۳۳		
حسنِ معاشرت اور صوفیۂ کرام	۱۳۶	علمار اور صوفیہ	۱۹۴
کرامات	۱۳۷	شریعت وطریقت	۱۹۶
نفسی کشی	۱۳۹	شاہ ولی اللہؒ اور توحید وجودی	۲۱۱
سلاطین اور صوفیہ کی زندگیوں میں تضاد	۱۴۰	سماع کا جھگڑا	″
مشائخ کے فیوض وبرکات	۱۴۹	قبر پرستی	۲۱۷
خواجگانِ چشت وسلاطین دہلی میں	۱۵۲	علمار اور صوفیہ کی مصالحت	۲۲۰
عجیب توارد		اشاعت اسلام	۲۲۵
خام وناپختہ کار صوفیہ	۱۵۴	اشاعت اسلام کا روشن اور تاریک پہلو	۲۳۱
حضرت مجددؒ کی اصلاحی کوششیں	۱۵۴		
عالمگیر کے بعد اچھے صوفیہ کا فقدان	۱۵۶	تسخیر ملک وتسخیر قلوب	۲۳۴
سلاطین ومشائخ وقت کا تصادم	″	تسخیر قلوب	۲۴۰
محمد بن تغلق اور صوفیہ کا تصادم	۱۶۸	تتمہ	۲۶۱
ف[illegible] اور صوفیہ کا تصادم	۱۷۰		

پیش لفظ

زیر نظر مقالہ اسلامی ہند کی تاریخ کے ایسے نازک مباحث پر ہے جس میں ادنیٰ لغزشِ قلم سے مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی نہ کوئی پہلو مجروح ہو جاتا ہے، اس لیے بہت کم لوگوں نے اس پر لکھا ہے اور جنھوں نے لکھنے کی کوشش کی وہ جادۂ اعتدال پر قائم نہ رہ سکے، لائق مصنف جن کی نظر اس دور کی تاریخ کے تمام گوشوں پر بہت گہری ہے جس اعتدال و توازن کے ساتھ اس پُر خار وادی کو طے کیا ہے، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے،

اس میں اسلامی ہند کی مذہبی، ذہنی اور فکری تاریخ پر اجمالی تبصرہ آگیا ہے اس میں بعض نئے پہلو بھی سامنے آئیں گے جو عام نگاہوں سے اوجھل تھے، ان میں بحث اور مصنف کے بعض نظریوں سے اختلاف کی گنجایش ہے، لیکن مورخین کے لیے ان پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، گو یہ نیا موضوع نہیں ہے لیکن بہت کم لوگوں نے ان پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے، اور مسلمانوں کے مذہبی، قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے اس نہج سے اسلامی ہند کی تاریخ لکھنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے یہ کتاب نمونہ کا کام دیگی۔

معین الدین احمد ندوی

۶ مئی ۱۹۶۴ء

دار المصنفین اعظم گ[ڈھ]

Marfat.com

دیباچہ

زیر نظر کتاب دراصل ایک مقالہ ہے جو پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اور مولانا عبد السّلام قدوائی ناظم شعبۂ دینیاتِ جامعہ ملیہ کی دعوت پر لکھا گیا، اور وہاں ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا، اس موقع پر جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ شہر کے ممتاز علماء اور عمائدین میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد میاں (ناظم جمعیۃ العلمائے ہند) مولانا ابو اللیث (امیر جماعت اسلامی ہند) حکیم عبد الحمید صاحب (مالک ہمدرد دواخانہ دہلی) قاضی سجاد حسین (صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی) اور جناب شاہ ضامن علی نظامی صاحب (سجادہ نشین درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء) اور دیگر معززین شہر نے بھی شرکت کی، مقالہ طویل تھا، اس لیے پورا پڑھا نہ جا سکا، لیکن جتنا پڑھا گیا اس پر دیر تک دلچسپ اور مفید مذاکرہ ہوتا رہا، جس سے اندازہ ہوا کہ حاضرین نے اس کو غور اور دلچسپی سے سنا، اور میری محنت رائگاں نہیں گئی،

اور جب یہ مقالہ معارف میں چھپنے لگا تو مذاکرہ اور سوالات کی روشنی میں کچھ مزید باتیں بڑھانی پڑیں، تاکہ جو چیز اس موقع پر نہ کہی جا سکی تھی، وہ اس مقالہ میں آسکے، اور اب یہ مقالہ کتاب کی صورت میں ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس مقالہ کو سنکر آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں یہ فرمایا تھا، کہ تاریخ قوموں کا حافظہ ہے، حافظہ [illegible] ہر حالت میں کام کرتا ہے، لیکن یہ حافظہ مصلحت اندیش ہو تو

اس سے بہت سی مضرتیں پیدا ہوتی ہیں، تاریخ پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے حافظہ نے مصلحت اندیشی سے بھی کام لیا ہے، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹا ہے، ہمارے مورخین گذشتہ نسلوں کے کمالات کو نمایاں کرکے دکھاتے ہیں اور انکی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے ہیں، یہ مسلّم ہے کہ اگر مریض کی ہسٹری طبیب کو بے کم وکاست نہ بتائی جائے تو طبیب علاج نہیں کرسکتا، ہماری قوم اخلاقی لحاظ سے مریض ہے، اور ہماری عقل اور ضمیر طبیب و مسیحا، مورخ وہی ہے، جو طبیب کو مریض کا اگلا پچھلا حال سچ سچ بتادے، خوشی کی بات ہے مقالہ نگار نے مصلحت پرستی سے کام نہیں لیا، بلکہ حق گوئی کا حق ادا کیا ہے،

ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کے بارہ میں مصنف سے زیادہ ناظرین خود صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں، البتہ اس مقالہ کو قلمبند کرتے وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے عروج وزوال کے اسباب کے بہت سے نئے گوشے ذہن کی آنکھوں کے سامنے آئے، جو اس مقالہ میں پھیلا کر پیش نہیں کیے جاسکے، دعا ہے کہ کسی اور موقع پر ان اسباب کو تفصیل سے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ۲۰ مئی ۱۹۶۴ء دار المصنفین اعظم گڈھ،

دوسرا ایڈیشن

یہ مقالہ مسلسل معارف میں چھپا، پھر کتاب کی صورت میں شایع ہوا، جس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے، اب اس کا دوسرا ایڈیشن ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، خاکسار مرتب کو خوشی ہے کہ یہ کتاب عام طور سے پسند کی گئی،

دار المصنفین، اعظم گڈھ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت کی نوعیت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے دورِ حکومت میں عام مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشوونما سلاطین، علماء، اور صوفیۂ کرام کے ذریعہ سے ہوئی، اگر عربوں اور غزنویوں کے عہدِ حکومت سے قطع نظر کرلی جائے تو ہندوستان کے باضابطہ مسلمان فرمانرواؤں کا عہد تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوکر انیسویں صدی کے وسط میں ختم ہوتا ہے، اس ساڑھے چھ سو برس میں تقریباً ۸۰ بادشاہ ہوئے، ان میں بعض تو یقیناً رند، بدمست اور بوالہوس تھے، جو اسلام کا نام لیکر حکومت کرتے رہے، مگر ان کی سیرت کسی لحاظ سے بھی اسلامی نہیں تھی، لیکن انہی حکمرانوں میں بعض خدا ترس بلکہ زاہد و عابد بھی ہوئے، بعض ایسے فاتح بھی تھے جن کی شجاعت اور نبرد آزمائی پر خود فنِ سپہ گری کو نا[illegible] بعض علوم وفنون کے ایسے سرپرست ہوئے کہ ان کی قدردانی سے علم

دادب تعمیرات اور فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ ہوا بعض کی کوششوں سے تہذیب و تمدن میں ایسے جلوہ ہائے صد رنگ پیدا ہوئے کہ ان سے آج تک ہندوستانی زندگی معمور رہی، ان حکمرانوں کا سب سے بڑا اور عمومی وصف یہ تھا کہ وہ عدل پرور اور انصاف پسند رہے اور برا سے برا حکمراں بھی یہ پسند نہ کرتا تھا کہ عوام اس کی عدل پروری اور انصاف پسندی سے بدظن ہوں،

اسلام کا نعرہ

ممکن ہے درۂ خیبر اور درۂ گومل سے آنے والوں کا اندرونی مقصد محض فتح و تسخیر اور حصولِ دولت ہی رہا ہو، لیکن وہ اسلام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آئے، اور گو انھوں نے اسلامی اور دینی حکومتیں قائم کرنے کے بجائے اپنی قبائلی اور خاندانی سلطنتیں بنائیں، لیکن ان ہی کی وجہ سے یہاں علما، صلحا، اور مشائخ کو قدم جمانے کا موقع ملا، اور گو اُن کے درباروں کی فضا اسلامی نہیں رہی، لیکن ان ہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا، اور گو انھوں نے تبلیغِ اسلام کی کوئی کوشش نہیں کی، لیکن ان ہی کی بدولت مبلغینِ اسلام کی کوششیں بارآور ہوتی گئیں اور مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔

یہ عجیب بات ہے کہ اچھے اور برے دونوں حکمرانوں نے جو کچھ کیا اسلام ہی کا نام لیکر کیا، وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف جانشینی کے لیے جنگ کرتے، لیکن جب تخت پر بیٹھتے تو اسلامی روایات کے مطابق امرا سے بیعت لیتے اور دینِ مبین کے حامی بننے کے لیے اس کے مناسب کوئی لقب اختیار کرنا ضروری سمجھتے، اسی لیے کوئی دین کا قطب، کوئی شمس، کوئی رکن، کوئی غیاث، کوئی جلال، کوئی نور کوئی شہاب بن جاتا، مورخین بھی ان میں سے کسی کو کہف الاسلام والمسلمین کسی کو رکن الاسلام والمسلمین کسی کو ظہیر الامت، کسی [illegible]

Marfat.com

اور کسی کو عمزاز دین وغیرہ کے لقب سے یاد کرتے، اور ان میں بعض فرمانروا ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی بادشاہت اور حکومت کی مذہبی توثیق کے لیے خلفائے بغداد سے سندیں بھی حاصل کیں اور اپنے نام کے ساتھ یمین الخلافت، ناصر امیر المومنین اور نائب امیر المومنین لکھتے، گو ان کی نجی زندگی خالص اسلامی نہیں رہی، پھر بھی شاید ہی کوئی ایسا حکمراں گذرا ہو جس نے کسی شیخِ وقت کے سایۂ عاطفت میں پناہ نہ لی ہو، یا ان سے فیوض و برکات حاصل نہ کیے ہوں، علما، تو ان کے دربار کا ضروری جز بن گئے تھے، سلاطین دہلی کے دور میں شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ اور صدر جہاں اور مفتی، متدین علمائے ہی مقرر کیے جاتے، اسی طرح عہد مغلیہ میں صدر الصدور اور قاضی القضاۃ کے عہدے علمائے دین ہی کو دیے جاتے،

حمیت اسلامی کا لحاظ، یہ فرمانروا اگرچہ پوری طرح اوامر و نواہی کے تو پابند نہیں ہوتے تھے، لیکن ان کی کوشش ہوتی کہ ان کے عہدہ دار معروف کو قائم کرتے اور منکر کو مٹاتے رہیں، اور احکام شرعی کی خلاف ورزی کے احتساب میں کوئی کوتاہی نہ کریں، ان میں سے بڑے سے بڑا دیندار حکمراں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے نمونہ کی بھی حکومت قائم نہ کر سکا، لیکن بڑے سے بڑے حکمراں کو بھی اپنی خودنمائی اور خود پرستی کے باوجود غیرتِ اسلامی کا خیال ضرور رہا اور جہاں حمیتِ اسلام کا سوال پیدا ہوتا وہاں ان کا مذہبی جوش ضرور ابھر آتا، یہ جب فاتح بن کر امرا کے جلو میں ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ حجازی، ساسانی، ترکستانی، تاتاری اور ایرانی روایات بھی لائے، اور یہاں ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی ماحول سے بھی متاثر ہوئے، اور ان کی معاشرتی تمدنی اور ... زندگی میں مختلف عناصر کی آمیزش رہی جس پر ان فرمانرواؤں کی

Marfat.com

شعوری اور غیر شعوری کوششوں سے اسلامی رنگ کی ایسی چھاپ پڑی کہ وہ غلط یا صحیح اسلامی معاشرت و تہذیب کہلانے لگی، اور اس کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی گئی، محلوں خصوصاً مقبروں کے بنانے میں جو اسراف کیا جاتا تھا، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے کبھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن اس کو بناتے وقت نہ صرف حکمراں بلکہ معمار بھی محسوس کرتے کہ وہ اسلامی فن تعمیر کو فروغ دیکر اسلام کی شوکت میں اضافہ کر رہے ہیں، اور آج تاج محل کو دینی نقطۂ نظر سے کتنا ہی بدعت اور اسراف تصور کیا جائے لیکن بڑے سے بڑا متقی اور متقشف عالم بھی اس کے اندر پہنچکر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس نادرۂ روزگار عمارت کے ذریعہ سے اگر اسلام کا نہیں تو اسلام کے نام لیواؤں کے جلال و جبروت اور عظمت و شوکت کا سکہ دلوں پر ضرور بیٹھا، قطب مینار اور آگرہ اور دہلی کے قلعوں کے بنانے والوں کے درباروں میں مسرفانہ بلکہ مشرکانہ رسوم و روایات بھی رہیں، لیکن انھوں نے جب یہ عمارتیں بنائیں تو لوگوں کو ایسا نظر آیا کہ ان کے کنگوروں، برجیوں اور میناروں پر اسلام کی رفعت و حشمت کے پرچم لہرا رہے ہیں،

عجیب ستم ظریفی: لیکن ان کے دور حکومت سے لیکر آج تک کے علماء ان کو اسلام کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے، ان کے مذہبی القاب کو محض ظاہری نمود و نمائش قرار دیتے ہیں، اور جن معاصر مورخوں نے ان کے مذہبی القاب کو سراہا ہے، ان کو چاپلوس، خوشامدی اور درباری مورخین کہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ ستم ظریفی بھی ہے کہ خود علماء کے گروہ میں جن اہل قلم نے مسلمان فرمانرواؤں اور راجپوتوں کی لڑائیوں کا ذکر کیا ہے، ان کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ یہ تمام لڑائیاں اسلام اور کفر کی معرکہ آرائیاں معلوم ہوتی ہیں، اور موجودہ دور کے غیر مسلم مورخوں نے ... کے

حوالے سے ان مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار قرار دیا ہے، اور ان کی خونریزی، سفاکی اور غیر مسلموں کے ساتھ بدسلوکی کو اسلامی تعلیمات کی طرف منسوب کر دیا ہے، نئے تعلیم یافتہ مسلمان اس قسم کے تاریخی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو اپنی تاریخ کی عظمت کا احساس ہونے کے بجائے ایک قسم کا تکدر پیدا ہوتا ہے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی ساڑھے چھ سو سالہ تاریخ کو اسلام کی یا محض چند خاندانوں کی تاریخ قرار دیں اس کشمکش سے ان کے قومی مفاخر میں طرح طرح کی محرومیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس ان کی گذشتہ طویل حکومت کا تاریخی سرمایہ ایسا نہیں جس پر وہ فخر کر سکیں، ماضی کا پرستار بن کر اس سے چمٹے رہنا تو کسی حال میں صحیح نہیں، لیکن یہ بھی درست نہیں کہ ایک قوم کے سامنے اس کے ماضی کی تاریخ اس طرح پیش کیجائے کہ اس کو پڑھ کر اس کا سر ندامت سے جھک جائے، آجکل تمام قوموں میں یہ ایک عام دستور ہو گیا ہے، کہ وہ اپنے داغدار اور تاریک ماضی کو تابناک اور روشن بنا رہی ہیں تاکہ ان کی مدد سے ان کا حال اور مستقبل صحت مند اور ترقی پذیر ہو۔

کیا مسلمان حکمراں اسلام کے نمایندے نہ تھے؟

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں اسلام کے نمایندے نہیں تھے، کیونکہ ان کی حکومتیں اسلامی اصول اور معیار پر قائم نہیں ہوئیں، لیکن یہ کہہ کر مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی نظر و فکر کی پراگندگی میں مبتلا کرنا بلکہ جذباتی طور سے ان کو ان کی تاریخ سے محروم کرنا ہے، کیونکہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جہاں بھی مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہ اس طرز کی نہ تھیں جن کو ہم اسلامی حکومتیں کہہ سکیں، بنی امیہ اور بنی عباس کی [illegible] تاریخ اسلام کہلاتی ہیں، حالانکہ ان کی حکومتیں بھی خلافتِ راشدہ

Marfat.com

کے اصولوں سے بہت دور تھیں۔ اس کے باوجود اُن کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی ماحول میں زیادہ تر اسلامی اثرات نمایاں رہے، اس لیے وہ اسلامی کہلاتی رہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی سیاست، تمدن اور معاشرت پر بھی اسلامی اثرات غالب تھے، اور جن مشکلات کا سامنا ان کو کرنا پڑا، وہ دوسرے اسلامی ملکوں کے فرمانرواؤں کو کرنا نہیں پڑا، انھوں نے ایسے ملک پر حکومت کی جہاں کی اکثریت ان کی ہم مذہب نہ تھی، اگر وہ سراسر اسلامی آئین و قوانین جاری کر کے حکومت کرنے کی کوشش کرتے تو ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، لیکن وہ اس مذہب کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، جس کے نام پر وہ حکومت کرتے رہے، اس لیے اس مکتبِ خیال کے حامیوں کی یہ رائے نظر انداز نہیں کیجا سکتی ہے، کہ ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے دورِ حکومت میں اسلام کو اس ملک میں اس طرح رکھا جس طرح کوئی بھرے ہوئے دودھ کے پیالے میں گلاب کی پنکھڑیاں رکھے،

اور جس گروہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان فرماں روا صلح و جنگ، مالِ غنیمت، محاصل اور مداخل میں تمام تر اسلامی قوانین کے پابند نہیں رہے، ان کا کہنا بھی صحیح ہے، لیکن دوسرا گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اکبر کی زندگی کے آخری دور سے قطع نظر کر لیا جائے تو ایک بھی فرمانروا ایسا نہیں گذرا جس نے اسلامی شرع کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو، کچھ ایسے سلاطین ضرور ہوئے جنھوں نے اپنی ہوس رانی، مفاد پرستی اور دنیا طلبی کی خاطر شریعت کی خلاف ورزی کی، پھر بھی وہ اس کے منکر نہیں ہوئے، اور زیادہ تعداد ایسے حکمرانوں [illegible]

Marfat.com

شرعی قوانین کے ظاہری احترام کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی اور اسی احترام کی خاطر بعض امور میں درباری علماء سے ایسے فتادے بھی حاصل کر لیتے جو دراصل درست نہ ہوتے، لیکن یہ علماے سوء کا قصور تھا، ایک حکمراں کیسا ہی جابر ہوتا یا اس کی نجی زندگی کیسی ہی بری ہوتی، لیکن وہ علی الاعلان شریعت کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اس کو مسلمانوں کا اعتماد اور جذبۂ اطاعت گذاری اُسی وقت تک حاصل رہتا تھا، جب تک وہ شرعی قوانین کا احترام کم از کم ظاہری طور پر قائم رکھتا، پھر ازمنۂ وسطیٰ میں مذہب لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا رہا، اس لیے بادشاہِ وقت مصلحۃً بھی اس کا احترام کرنے پر مجبور تھا، اور بعض تو مذہبی قوانین کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرنے ہی میں اپنی سعادت اور مقبولیت سمجھتے تھے، سلاطین دہلی میں نومسلم حکمراں ناصر الدین خسرو کی حکومت اس لیے ختم ہوگئی کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر اسلام کی تذلیل شروع کر دی تھی، اکبر جیسے جلیل القدر اور ہوشمند حکمراں کے خلاف اس کی اخیر زندگی میں مسلمانوں میں ایک عام بے چینی اسلیے پیدا ہوگئی تھی کہ اس کی وجہ سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا، اور بعض علماء نے تو اس کے خلاف جہاد تک کا فتویٰ دیدیا تھا، دارا اورنگزیب کے خلاف اس لیے بازی نہیں لے جا سکا کہ مسلمانوں کی نظر میں اس کے مذہبی عقائد مشکوک ہو گئے تھے،

یہ گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں کلی طور پر اسلامی شریعت کے علمبردار نہیں بن سکے، لیکن وہ اسلامی شریعت کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے، وہ تمام اسلامی قوانین کا نفاذ تو نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے اسلام کی [illegible] کی پاسبانی ضرور کی، یہ اور بات ہے کہ ان سے ان کے ہم مذہبوں کو

Marfat.com

جتنی توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں،

کیا بادشاہت غیر اسلامی طرز حکومت ہے؟

اسی گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس طرح ہمارے گذشتہ علماء، صلحا، اور صوفیہ ہمارے ورثہ میں داخل ہیں، اسی طرح مسلمان فرمانروا بھی خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ہمارے ورثہ ہی ہیں، ان کے ذریعہ بھی، ہماری مذہبی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ بنی ہے، اور آج ہمارے احتجاج کے باوجود غیر مسلم مورخین ان ہی کے کارناموں کی روشنی میں اسلام کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے ان پر تنقید اور نکتہ چینی کرتے وقت ہم پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور ان کی بادشاہت کو محض اس لیے غیر اسلامی طرز کی کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ہیں، کہ یہ خلافتِ راشدہ کے اصول پر قائم نہیں تھی،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ بڑے ہی صاحبِ فکر، صاحبِ بصیرت اور صاحبِ عزیمت علماء تھے، جن پر ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہے گا، حضرت مجددؒ کی تجدیدی کوششوں سے ہندوستان میں اسلام کو حیاتِ نو ملی، انھوں نے جہانگیر سے ٹکر تو لی مگر اس کی کوشش نہیں کی کہ مغلوں کی خاندانی بادشاہت کو خلافتِ راشدہ کے طرز حکومت میں تبدیل کر دیا جائے، کیونکہ انھوں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اس دور میں ہندوستان جیسے ملک میں بادشاہت کے علاوہ کوئی اور طرز حکومت ممکن نہیں ہے، اس لیے انقلابی قدم اٹھانے کے بجائے اصلاحی اور تجدیدی طریقہ اختیار کیا، اور بادشاہ وقت کو زیادہ سے زیادہ مذہبی بنانے کی کوشش کی، اپنے ایک مکتوب میں خان جہان کو تحریر فرماتے ہیں کہ "سلطان روح کی طرح ہے، اور تمام انسان بدن کی طرح ہ[illegible] ہے،

Marfat.com

تو بدن بھی درست ہے، اگر روح خراب ہے تو بدن بھی خراب ہے، اس لیے اصلاح بادشاہ کی جدوجہد تمام اولادِ آدم کی اصلاح کی جدوجہد ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ بادشاہ کے لیے بددعا تمام مخلوق کے لیے بددعا ہے، جو بادشاہ کو نقصان پہنچاتا ہے وہ ساری مخلوق کو نقصان پہنچاتا ہے، اور جو بادشاہ کو نقصان پہنچاتا ہے، میں اس سے بیزار ہوں"۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بادشاہت اسلامی اسپرٹ کے خلاف ضرور ہے لیکن اقتضائے زمانہ اور مصالحِ ملکی کی خاطر گوارا بھی کیجا سکتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بادشاہوں کے اوصاف و فرائض بتا کر ان کو صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کی ہے، اس سے بھی بڑھ کر صحابۂ کرامؓ اور بڑے بڑے ائمہ نے حالات سے مجبور ہو کر بنی امیہ اور بنی عباس کی موروثی بادشاہت قبول کرلی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بادشاہت کو مطلق رد کر دینے والا طرزِ حکومت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور اگر بادشاہت بالکل غیر اسلامی طرزِ حکومت ہے تو یہ مذہبی طبقہ کی بے بسی اور مجبوری کی بڑی دردناک تاریخ ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ساڑھے چھ سو برس تک بادشاہت رہی، لیکن وہ عوام کو اس کے خلاف صف آرا نہ کر سکے، حالانکہ یہی عوام معمولی سے معمولی باتوں پر علماء کے فتوی سے ایسے مشتعل اور بے قابو ہو جاتے کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، ایشیائی مزاج ہر جگہ بادشاہت ہی کو قبول کرتا رہا، اور پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ اسلام میں عبادات، معاملات اور اخلاقیات کی تمام جزوی باتوں کے لیے تفصیلی احکام موجود ہیں، اس کے برخلاف سیاسی نظام کا خاکہ تو ضرور موجود ہے لیکن بہت زیادہ واضح نہیں، اسی [illegible] ہوتا ہے کہ اسلام نے سیاسی نظام کو قصداً غیر واضح چھوڑ دیا ہے،

کہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جیسی حکومت کی ضرورت ہوگی لوگ خود قائم کرلیا کریں گے، کیونکہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے موزوں ہے، اگر شروع میں اس کا کوئی مکمل سیاسی نظام مقرر کر دیا جاتا تو ممکن ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے لیے موزوں نہ ہوتا، اور اگر یہ خیال صحیح ہے تو بعض حالات میں بادشاہت بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہے،

عام طور سے بادشاہت کو غیر اسلامی طرز حکومت کہکر اس لیے برا کہا جاتا ہے کہ بہت سے بادشاہوں کی نجی زندگی اچھی نہیں رہی، اور ان کے محلوں کی زندگی قیصر و کسریٰ سے زیادہ شاندار تھی، جس کو اسلام نے مٹانے کی کوشش کی تھی، لیکن انکی شخصی برائیوں کے باوجود ان کی ذات سے مسلمانوں اور ملک کو بہت سے اجتماعی فوائد پہنچتے رہے، ایسی حالت میں ان کی نجی کمزوریوں کے پیچھے پڑنا یا ان کو غلطیوں کے لیے ندامت سے سر جھکانا یا ان کے ذاتی افعال کی وجہ سے ان کے مذہب کو زیر بحث لانا ایک بڑی غلطی اور تاریخی دیانتداری کے خلاف ہے۔ دوسری قوموں کے فرماں رواؤں کی تاریخ میں اس قسم کی بحث قصداً نظرانداز کر دی جاتی ہے۔

علماء کے قدم جمنے کا ذریعہ، مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندستان میں علماء اور صوفیہ کو قدم جمانے کا اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا، اور ہر دور میں بکثرت علماء پیدا ہوتے رہے، سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیشاپور، صغان، غزنیں، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، اور یہ اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے، حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد کم رہی، اس لئے ہندوستانی فقہ میں عراقی [illegible] رجحانی

اثرات زیادہ غالب رہے، اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی، جس کی باضابطہ تدوین فتاویٰ تاتارخانی اور فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ہوئی۔

علماء کا شاندار اجتماع | سلاطین دہلی کی حکومت میں سب سے زیادہ علماء، علاء الدین خلجی کے دور میں تھے، ان کا اتنا شاندار اجتماع ہو گیا تھا، کہ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے، کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، صفاہان، رے اور روم میں یہاں کے جیسے علماء نہیں پائے جاتے تھے، جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھنے والے علماء یہاں موجود تھے، مولانا ضیاء الدین برنی اُن پر فخر کرتے ہوئے یہانتک لکھ گئے ہیں کہ بعض علماء تو امام غزالی اور امام رازی کے ٹکر کے تھے، اور فقہ کے بعض ماہرین کو امام ابویوسف اور امام محمد کا مرتبہ حاصل تھا' خود امیر خسرو کو دہلی پر فخر تھا، انھوں نے اس کو قبۂ اسلام کہکر یاد کیا ہے، محمد تغلق کے زمانہ میں علماء کی تعداد اور بھی بڑھ گئی تھی، قلقشندی کا بیان ہے کہ دو سو فقہاء سلطان کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے، اور وہ ان سے مذہبی مذاکرے کیا کرتا تھا، فیروز شاہ تغلق فقہاء سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے فتاوائے فیروز شاہی کے نام سے فقہ کی تدوین کرائی، جو زیادہ مقبول نہ ہو سکی، سکندر لودی کی خوابگاہ میں روزانہ رات کو ستر علماء جمع ہوا کرتے تھے، اور وہ ان سے فقہی مسائل دریافت کیا کرتا تھا۔

عہد مغلیہ کے علماء | عہد مغلیہ میں بھی علماء کی تعداد بہت تھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنے عہد کے جن ممتاز علماء کے حالات لکھے ہیں، اُن کی تعداد ۶۹ ہے، اسی طرح مآثر رحیمی [illegible] نے ایسے ۳۲ علماء کا ذکر کیا ہے، جو عبدالرحیم خانخاناں کے

Marfat.com

دامنِ دولت سے وابستہ تھے، عہد عالمگیر میں جو علما، اس کے دربار میں مختلف خدمات پر مامور تھے، ان کی تعداد بیالیس ہے، عالمگیر کے زمانہ سے مولانا شاہ عبد الرحیم کے خاندان سے جو سلسلۃ الذہب چلا اس پر مسلمانوں کو آج بھی فخر ہے، ان علماء کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس دور میں بھی شیراز، کاشان، تبریز، گیلان، مشہد اور ترکستان سے کچھ علما، ضرور آتے رہے، لیکن ان کے مقابلہ میں ہندوستانی علماء کی تعداد زیادہ رہی، اور حنفی فقہ کی ترویج اور اس کی باضابطہ تدوین فتاوے عالمگیری کی شکل میں ہوئی، جس کو عالمگیر کا ایک عظیم الشان علمی وفقہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے، حنفی فقہ سے شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعی فقہ کا تصادم ضرور ہوا، لیکن اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں ہی کی رہی، اور یہ مغلوں کی بادشاہت کا دلچسپ پہلو ہے، کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امرا ر مامور رہے، محل ایک عرصۂ دراز تک راجپوت شہزادیوں کے زیر نگیں رہا لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا، جو مغل فرمانرواؤں کی غیر معمولی رواداری کا ثبوت ہے، لیکن اسی کے ساتھ حنفی علمار کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی سراہنے کے لائق ہے،

علمار کی قسمیں | سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں علماء کی کئی قسمیں تھیں،

(۱) پہلی قسم میں وہ علماء تھے جو کسی حال میں بھی حکمراں طبقہ سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، بلبنی عہد میں مولانا کمال الدین زاہد بڑے پایہ کے عالم تھے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اُن کے شاگردوں میں تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے ان کے پیچھے ایک بار نماز پڑھی تو اس کو لذت محسوس ہوئی، اس نے ان کو اپنا مستقل امام بنانا چاہا، انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کیا کہ ... نماز کے سوا

اور کیا ہے، کیا سلطان اس کو بھی چھین لینا چاہتا ہے،

شاہجہانی عہد میں مولانا عبدالرشید جونپوری صاحب رشیدیہ کی شہرت پھیلی تو شاہجہان کو ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی، اس نے ان کو ایک قاصد کے ذریعہ اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، انھوں نے انتہائی استغنا کے ساتھ کہلا بھیجا،

دنیا اگر دہند نخیزم زجائے خویش

من بستہ ام حنائے توکل بپائے خویش

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم کچھ دنوں فتاوائے عالمگیری کی تصحیح کے لیئے عالمگیری دربار سے وابستہ ہوگئے تھے، مگر ان کے مرشد مولانا ابوالقاسم نے یہ وابستگی پسند نہیں کی اس لیئے وہ اس سے علٰحدہ ہوگئے، ایک بار عالمگیر نے شوق ملاقات کا پیام ان کے پاس بھیجا، مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا، اور ایک معمولی کاغذ پر جس میں ان کا جوتا لپٹا ہوا تھا، یہ عبارت لکھ کر شہنشاہ ہندوستان کے پاس بھیجدی

"اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو کسی امیر کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ "دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت ہی قلیل ہے" تمکو اسکا بھی قلیل ترین جزو ملا ہے، اگر بالفرض اس میں سے مجھے بھی دو گے تو وہ جزو لایتجزیٰ ہوگا، اس ٹکڑے کے لیئے میں اپنے نام کو خداوند تعالیٰ کے دفتر سے کیوں کٹواؤں، حضرت شیخ کے ملفوظات میں مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے حق تعالیٰ دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے"

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ صاحب اس خط کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ سنا گیا ہے کہ جب بادشاہ کو یہ رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اسکو

Marfat.com

جیب میں رکھ لیتا، اور فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا،

پاک طینت علماء

اس طرح کے پاک طینت علماء نے اپنے کردار کو ہر حال میں اعلیٰ اور اونچا رکھا، اور ان کا عمل دوسرے علماء کے لیے نمونہ بنا، اور گو وہ اپنے کردار کی اس بلندی سے پوری قوم کو اپنا جیسا نہ بنا سکے، لیکن اس کے افراد ان سے ضرور متاثر ہوئے، ایسے علماء یا گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے یا علوم و فنون کی خدمت میں وقت صرف کرتے،

درس وتدریس میں مشغول رہنے والے علماء

(۲) دوسری قسم میں وہ علماء تھے جن کا مشغلہ درس وتدریس تھا، ہر زمانہ میں سلاطین و امراء کی سرپرستی کی وجہ سے مالک میں بکثرت مدارس تھے، ان کے معلمین کے وظائف خزانہ شاہی سے مقرر ہوتے تھے، اور وہ فراغ خاطر کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہتے، ان وظائف کے لئے مدد معاش کی اصطلاح تھی اس سے تعلیم مفت، عام اور سہل الحصول ہوگئی تھی، صبح الاعشیٰ میں ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، جن میں ایک شوافع کا اور باقی سب احناف کے تھے، فیروز شاہ کے دور میں اس زمانہ کا قائم کیا ہوا مدرسہ فیروز شاہی ہندوستان کا سب سے اچھا اور ممتاز مدرسہ تھا، اس کے تمام اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جاتے تھے، اس کے زمانہ میں علماء و مشائخ کی تنخواہوں میں چھتیس ۳۶ لاکھ ٹنکے خرچ ہوتے تھے، آگرہ کے متعدد مدارس میں شیراز اور دوسرے ممالک کے معلمین تعلیم دیتے تھے، اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، ابوالفضل کا بیان ہے، کہ اس کے مقابلہ میں کوئی سیاح کسی دوسرے مدرسہ کا نام نہیں بتا سکتا تھا، جہانگیر نے یہ قانون بنا دیا تھا، کہ اس کی مملکت میں جہاں بھی کوئی مالدار رئیس [illegible] نشین

یا وارث کے بغیر مرجاتا تو اُس کی تمام جائداد اور املاک حکومت کی ملک ہو جاتی اور وہ مدرسوں اور خانقاہوں پر صرف ہوتی،

عالمگیر نے تمام شہروں اور قصبوں میں مکاتب قائم کیے، لائق اساتذہ کو وظائف اور جاگیریں دیں اور طلبہ کے لئے روزینے مقرر کیے، ان شاہی مدرسوں کے علاوہ خانقاہوں، مسجدوں اور رئیسوں کے گھروں پر بھی معلم ہوا کرتے تھے، صبح الاعشیٰ کے مصنف کا بیان ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ٹھٹھ میں مختلف علم و فن کے چار سو مدرسے تھے، اور ایسے مدارس تمام صوبوں میں آخر آخر وقت تک رہے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ

"صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصہ میں پانچ پانچ کوس اور زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفاء اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے، جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ، جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں، انھوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں، جہاں اساتذہ اور مدرسین علمی فیض رسانی میں مشغول رہتے ہیں،"

ان مدارس کے علماء خاموشی سے درس و تدریس میں لگے رہتے، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ علاء الدین خلجی کے عہد تک اتنے علماء جمع ہو گئے تھے کہ بخارا، سمرقند اور بغداد میں بھی اس پایہ کے علماء نہ تھے، یہ منقولات، معقولات، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول دین، لغت، معانی، بدیع، بیان، کلام اور منطق جملہ فنون کی تعلیم دیا کرتے تھے، ان کے فیض سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، ان سے حصول تعلیم کے لیے بیرونی ممالک تک کے بھی طلبہ آیا کرتے تھے، باہر سے بھی علماء برابر آتے رہے، مثلاً منطق و فلسفہ کے مشہور امام قطب الدین رازی کے شاگرد، ادوں لے آکر ہندوستان میں درس دیا، ان ہی میں فیروز شاہی عہد کے

Marfat.com

مشہور عالم مولانا جلال الدین دوانی تھے، حافظ ابن حجر کے خلیفہ اکبر علامہ سخاوی کے متعدد شاگردوں نے آکر ہندوستان میں حدیث کا درس دیا، جن میں مولانا رفیع الدین اللابجی الشیرازی، اور مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی زیادہ مشہور ہیں، مولانا رفیع الدین آگرہ میں مقیم رہے، سکندر لودی ان کا بڑا معتقد تھا، مولانا راجح کا حلقہ درس احمد آباد میں تھا، سکندر لودی کے عہد میں شیخ عبد اللہ تلبنی اور ان کے بھائی شیخ عزیز اللہ تلبنی بڑے مشہور مدرس تھے، شیخ عبد اللہ کے درس میں سکندر لودی چپکے سے آکر شریک ہوجاتا اور استفادہ کرتا، ان کے حلقہ درس سے چالیس جید علما نکلے، جن میں مشہور مولانا الہداد جونپوری، میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بداؤنی تھے، مولانا عزیز اللہ کے حافظہ اور معلومات کی بڑی شہرت تھی، وہ مطالعہ کے بغیر مشکل سے مشکل کتابیں پڑھاتے تھے، ان ہی کے شاگردوں میں مولانا حاتم سنبھلی تھے جنھوں نے اپنے حلقہ درس میں بیس بار شرح مفتاح اور چالیس بار مطول ختم کرائی۔

تیموریوں کے دور میں ان مدرسین کی بدولت ٹھٹھ سے لیکر بنگال تک علما، اور اہل ہنر پیدا ہوتے رہے، جونپور، ظفر آباد اور عظیم آباد میں علما کی بڑی تعداد ہوگئی، اسی لئے شاہ جہاں کہا کرتا تھا کہ

پورب شیراز مملکت ماست

تیمور کے حملہ کے بعد قاضی شہاب الدین دولت آبادی دہلی سے جونپور آئے تو بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ ان کے فضل وکمال سے مشرق کی ساری زمین لہلہا اٹھی کٹرہ سے لیکر غازیپور تک یکساں فیض جاری ہوا، مولانا قطب الدین ابو الغیث بن نور الدین ابی محمد المتوفی ۸۶۹ھ، ملا شیخ عبد الملک عادل فاروقی [illegible] بن عطا ملک،

برادر شیخ عبدالملک، شیخ محمد عیسیٰ جونپوری جیسے علما ان کے تلامذہ میں تھے،

سید عبدالاول جونپوری ہندوستان میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، اسی سرزمین سے دیوان عبدالرشید اور ملا محمود جونپوری پیدا ہوئے جن کے بارے میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علماے وقت کبھی اکٹھا نہیں ہوئے، فن مناظرہ میں دیوان عبدالرشید کی کتاب رشیدیہ اور فلسفہ میں ملا محمود جونپوری کی شمس بازغہ سے اب تک فیض پہنچ رہا ہے

شاہجہانی عہد میں پنجاب بھی درس وتدریس کا بڑا مرکز رہا، اسی عہد میں ملا عبدالسلام لاہوری اور عبدالسلام دیوی کے فیض سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، ملا عبدالسلام دیوہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، تعلیم ملا عبدالسلام لاہوری سے پائی، اودھ میں قیام کرکے درس وتدریس میں مشغول رہے، ان ہی کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق ومغرب میں شروع ہوا، ان ہی کے شاگردوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے، جن کی تصانیف عرب وعجم تک پھیلیں، ملا دانیال چوراسی اور شیخ محب اللہ الہ آبادی ملا عبدالسلام دیوی کے شاگرد تھے،

اسی عہد میں ملا محمد فاضل، قاضی محمد اسلم، ملا میرک، ملا عبداللطیف سلطانپوری میر محمد ہاشم گیلانی کا سلسلۂ تلمذ بہت وسیع تھا، عالمگیری عہد میں ملا محمد یعقوب، شیخ عبدالعزیز اکبرآبادی، شیخ قطب برہانپوری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا محمد اکرم لاہوری، حافظ ابراہیم، ملا عبدالباقی جونپوری، سید سعد اللہ سلونی اور قاضی محب اللہ بہاری اور ملا زاہد مسند درس وتدریس پر فائز رہ کر علوم وفنون کی بڑی خدمت اشاعت کی، قاضی محب اللہ بہاری کی سلم ومسلم نے بقول مولانا شبلی

Marfat.com

درسِ نظامیہ کے نصف نصاب کو اپنے پنجے میں تقریباً دو سو سال دبائے رکھا، انکی مسلم الثبوت اصول فقہ میں بڑی جامع کتاب سمجھی جاتی ہے، اس سے بھی طلبہ کو بڑا فیض پہنچا، ان میں سب سے زیادہ مشہور میرزاہد ہوئے، جن کا رسالہ میرزاہد معقولات میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے، ان ہی کے سلسلۂ تلمذ میں شاہ ولی اللہ صاحب کا مشہور خاندان تھا،

بعض امرا کو بھی درس دینے کا شوق تھا، بلبن کے مستوفی الممالک کے شاگردوں میں دہلی کے بہت سے علماء بھی تھے، اکبری عہد کے مشہور منصب دار میر فتح اللہ شیرازی کو جب ملکی اور مالیاتی کاموں سے فرصت ملتی تو معقولات کا درس دیا کرتے تھے، ان کے شاگرد ملا عبدالسلام لاہوری تھے، جن سے مولانا عبدالسلام دیوی نے تعلیم پائی، پھر مولانا عبدالسلام دیوی کے شاگرد ملا دانیال چوراسی تھے، ان سے مولانا قطب الدین سہالی کو شرفِ تلمذ حاصل تھا، ان سے قطب الدین شمس آبادی اور ملا امان اللہ بنارسی نے درس لیا، اور انہی کے نامور شاگرد ملا نظام الدین درسِ نظامیہ کے بانی ہوئے، جس سے پورے ہندوستان کو فیض پہنچا، اس طرح درس نظامیہ کی تعلیم کا سلسلہ امیر فتح اللہ شیرازی سے ملتا ہے،

ان علماء میں بعض مدرسین ایسے بھی تھے جن کے ذریعہ علم حدیث کی بڑی خدمت و اشاعت ہوئی، مثلاً مولانا عنایت اللہ کشمیری (المتوفی ۱۱۲۵ھ) نے چھتیس ۳۶ بار بخاری کو مذاکرہ کے ساتھ ختم کیا، ایسے بھی تھے، جن کو پوری صحاح ستہ اور مشکوٰۃ زبانی یاد تھی، بابا داؤد کو مشکوٰۃ المصابیح پوری حفظ تھی، اس لئے ان کے نام کے ساتھ مشکواتی لکھا جاتا تھا، حضرت مجددؒ الف ثانی کے پوتے شیخ محمد فرخ ... ہزار

حدیث سند کے ساتھ یاد نہیں، آخری دور میں مولانا رحمت اللہ الہ آبادی کو صحاح ستہ ازبر تھی، بعض اساتذہ کے لیے درس و تدریس ان کی روح کی غذا اور عبادت بن گئی تھی، مولانا عبدالسلام لاہوری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ساٹھ سال تک درس درس دیتے رہے، ملا جیون نے زندگی کے آخری دن تک درس دیا، ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ ان کے استاد مولانا عبداللہ بدایونی اپنے گھر کا سودا خود خریدنے بازار جایا کرتے تھے، طلبہ اُن کے ساتھ ہوتے اور وہ سبق پڑھاتے تھے،

ان علماء کے تلامذہ حصولِ تعلیم کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل جاتے، وہی عوام میں اسلام کے نقیب و محافظ ہوتے، یہ جوش ایمانی سے معمور ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت اسلام کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے، اکثر قصبوں اور گاؤں میں شہید بابا کے مزارات ان ہی کے ہیں، یہ وہ بزرگانِ دین ہیں جنھوں نے اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جانیں دیں، ان کے حالات تاریخوں اور تذکروں میں تو نہیں ملتے، لیکن ان کے مزارات کے ساتھ مقامی باشندوں کی عقیدت برابر قائم ہے، یہ عوامی علماء، عوام کو چھوٹے بڑے مذہبی مسائل سے واقف کراتے، ان کی خلاف ورزی پر سختی کے ساتھ دارو گیر کرتے، ان کے فتووں کا خوف عوام پر ایسا غالب رہتا تھا، کہ گو وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت سے غیر اسلامی اعمال کے مرتکب ہوتے مگر اسلام کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے ہی میں اپنی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات سمجھتے، اور یہ ان ہی عوامی علماء کا فیض ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے مقامی اثرات تو قبول ضرور کیے لیکن اسلام سے بہت دور نہیں ہونے پائے، وہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ گھل مل کر ضرور رہے

لیکن اپنی انفرادیت کو ہر حال میں قائم رکھا، اور اپنی ہر چیز کو مذہب کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے رہے، کبھی ان کے مذہبی جذبات دب جاتے، مگر ضرورت کے وقت آسانی سے ابھر آتے، یا ابھار دیے جاتے، مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے حکمران طبقہ بھی برابر فائدہ اٹھاتا تھا، چنانچہ راجپوتوں سے جو لڑائیاں ہوئیں ان کے اسباب زیادہ تر ذاتی یا سیاسی ہوتے مگر ان کو جہاد کا رنگ دیدیا جاتا، جس سے عام مسلمانوں اور لشکریوں کی مجاہدانہ اسپرٹ ابھر آتی اور وہ غازی کا درجہ یا شہادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے پوری جانبازی اور سرفروشی سے کام لیتے، اور جب یہ جذبہ ابھر جاتا تو بہتر سے بہتر آلات حرب اور عمدہ سے عمدہ فوجی تنظیم سے زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوتا،

حکمران طبقہ کے معاون علماء،

(۳) تیسری قسم میں وہ علماء تھے جو حکمراں طبقہ کے معاون اور مددگار رہے، گوشہ نشین علماء اور ایسے علماء کو جاگیردار، دنیا دار، جاہ پرست کہتے، وہ بھی جواب میں کہتے کہ گوشۂ عافیت میں بیٹھکر عبادت و ریاضت سے عاقبت تو ضرور سنور جاتی ہے، لیکن دین اور ملت کو نقصان پہنچ جاتا ہے، اور انکا یہ کہنا بے جا بھی نہ تھا، کیونکہ جو علماء دربار سے وابستہ ہوے وہ اچھے یا برے جیسے بھی رہے ہوں، مجموعی حیثیت سے وہ دربار اور حکومت پر بہرحال اثر انداز ہوئے، قطب الدین ایبک علماء کو ہمیشہ شریعت کی انگوٹھی کے نگینے سمجھتا رہا، اور اسی وجہ سے لاہور اہل تقویٰ اور اصحاب فتویٰ کا مسکن بن گیا، اس نے حکم دیدیا تھا کہ مسلمانوں سے غیر شرعی خراج کے بجائے صرف شرعی خراج لیا جائے، ایلتمش کی مجلسوں میں علماء میں بادشاہت کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر مذاکرے ہوتے تھے، ان کا خلاصہ

Marfat.com

یہ ہے کہ بادشاہ کو جو عزت حاصل ہوئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے، اپنے کو گوناگوں فضائل سے آراستہ کرے، اپنے قول و فعل اور حرکات و سکنات کو ایسا پسندیدہ بنائے کہ اہل اسلام میں اس کا اعتبار قائم اور آخرت میں اس کی نجات ہو، اس طرح حکومت کرے کہ لوگوں کے اوصاف و اخلاق شریعت کے مطابق ہو جائیں، ان کے معاملات صحیح ہوں، فسق و فجور ملک میں باقی نہ رہے، اپنے قہر، سطوت، قوت، شوکت، خدم و حشم اور خزانے کو خدا اور رسول کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرنے میں صرف کرے، عدل و احسان کے ذریعہ ملک کو ظلم و تعدی سے پاک کرکے لوگوں میں ایسے اخلاقی فضائل پیدا کرے کہ ساری برائیاں دور ہو جائیں، خدا ترس، متقی اور متدین قاضی، محتسب اور حکام مقرر کرے کہ رعایا انصاف اور دینداری سے مستفید ہوتی رہے، رعایا میں دینداری اور حسن اعتقاد پیدا ہو جائے کہ ان میں غداری، مکاری، فریب نفاق، بددیانتی، نفع خوری اور احتکار کے بجائے سچائی اور حق پرستی آجائے، ایک حکمراں کو نیک، سچا، خدا ترس، دیندار اور عبادت گذار ہونا چاہیئے، کیونکہ اگر اس میں خدا ترسی، دینداری، عبادت گذاری ہے، تو اس کی مملکت کے تمام چھوٹے بڑے، عورت، مرد، بوڑھے، جوان ان اوصاف حسنہ سے متصف ہو جائیں گے، اور اگر بادشاہ اور اس کے حکام میں اوصاف ذمیمہ ہیں اور وہ فسق و فجور میں مبتلا ہیں تو رعایا بھی فاسق و فاجر ہو جاتی ہے، اور ایک حکمران اور اس کے تمام حکام و عمال کو باطن کی آرائش میں لگا رہنا چاہیئے، ظاہر کی آرائش تو سب ہی کرتے ہیں، لیکن باطن کی آرائش ہی حکمرانی اور بادشاہت کا سب سے بڑا وصف ہے،

Marfat.com

علمار کا اثر سلاطین پر | یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام سلاطین ان اصولوں اور نصیحتوں کے پابند رہے، کیونکہ سلاطین دہلی میں کیقباد، رکن الدین فیروز شاہ، علاء الدین مسعود شاہ، قطب الدین مبارک خلجی اور ناصر خسرو جیسے نااہل، رند اور بدمست حکمراں بھی گذرے ہیں، لیکن علمار نے ان اصولوں اور نصیحتوں کا اعلان کر کے اپنا فرض ضرور انجام دیدیا اور اکابر سلاطین میں ایلتتمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، جلال الدین خلجی، غیاث الدین تغلق، محمد شاہ تغلق، فیروز شاہ تغلق، اور سکندر لودی نے ان اصولوں پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کی، طبقات ناصری کے مولف نے شمسی عہد کی دہلی کو مرکز دائرۂ اسلام اور مہبط اوامر ونواہی شریعت کہا ہے، ناصر الدین محمود تقوی، کسر نفسی اور حُب رسول میں اپنی مثال آپ تھا، بلبن کا قول تھا کہ حکمرانی کے زمانہ میں ایک حکمران سے جتنی باتیں خداوند تعالیٰ کی رضا اور سنت کے خلاف ہوتی رہتی ہیں وہ معاف ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ حمیت اسلام اور شعائر اسلام کو برقرار رکھنے کی خاطر امر معروف ونہی منکر کے مطابق احکام شرعی کو رواج دینے میں کوشاں رہے، ضیاء الدین برنی جیسے سخت گیر مورخ کو بھی اعتراف ہے کہ بلبن کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی، جلال الدین خلجی پنج وقتہ نماز کا ہمیشہ پابند رہا، سفر میں بھی روزے رکھتا، اور روزانہ کلام پاک کا ایک پارہ تلاوت کرتا، اور اس پر مذہبی اثرات سے لینت اور مسکنت کچھ ایسی غالب رہی کہ وہ اچھا حکمراں ثابت نہیں ہوا، وہ خود کہا کرتا کہ اس کے محل کے سامنے جمنا کے کنارے بت پرستی ہوتی رہتی ہے، لیکن وہ اس کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا، پھر بھی جمعہ کے دن منبر دن سے اس کے حامی الاسلام ہونے کا اعلان ہوتا رہتا ہے،

Marfat.com

تاتاریوں کے خلاف وہ برابر لڑتا رہا اور اس کو خیال ہوا کہ اگر وہ مجاہد فی سبیل اللہ کا خطاب اختیار کرے تو بے محل نہ ہوگا، لیکن پھر اس کو خود ہی خیال ہوا کہ معلوم نہیں اس نے تاتاریوں سے اپنی شہرت کے خاطر جنگ کی ہے یا اعلائے کلمۂ حق اور شہادت حاصل کرنے کے لیے، اور اسی کشمکش میں اس نے یہ لقب اختیار کرنا پسند نہیں کیا،

مولانا ضیاء الدین برنی نے غیاث الدین تغلق کی عبادت و ریاضت، پاکیٔ نفس اور اخلاقِ حمیدہ کی تعریف دل کھول کر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس عہد میں احکام شریعت کے جاری کرنے کی وجہ سے قاضیوں، مفتیوں، دادبکوں، اور محتسبوں کی بڑی عزت ہو گئی تھی، سلطان محمد تغلق تخت پر بیٹھا تو اس نے غیاث الدین، علاء الدین اور قطب الدین جیسے القاب اختیار کرنے کے بجائے جوناخاں کا نام بدل کر صرف محمد نام رکھا، اور کہا کہ بنی آدم میں اس سے بڑا نام کوئی اور نہیں، اس لیے کسی دوسرے لقب کی ضرورت نہیں اس نے اپنے سکوں پر محمد سنن خاتم النبیین، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم نقش کرایا تھا، وہ نہ صرف صوم وصلوٰۃ کا بڑا پابند تھا، بلکہ نوافل ومستحبات بھی نہ چھوٹتے تھے، اس کا حکم تھا کہ جب وہ محل میں داخل ہو تو نامحرم عورتیں پردہ میں چلی جائیں کہ اس کی نظر ان پر نہ پڑے، ہدایہ اس کے نوک زبان تھی، فقہا سے برابر مناظرہ کیا کرتا، چونکہ خود بہت ہی ذہین تھا، اور تمام علوم پر گہری نظر رکھتا تھا، اس لیے بعض اوقات مجتہدانہ باتیں کرتا، جس سے لوگوں کو شک ہوتا کہ مبادا وہ پیغمبری کا دعویٰ نہ کر بیٹھے، اس لیے اس کی جانب سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی گئیں، لیکن وہ جیسا بھی رہا ہو، اسکا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے

Marfat.com

اپنی سلطنت میں مذہب کی روح پھونک دی، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی دیجائے، اور بہت سے آدمی اس بات پر مامور تھے، کہ جماعت کے وقت جو شخص جہاں مل جائے اس کو پکڑ کر مسجد میں لے آئیں، یہانتک کہ دیوان خانہ کے سائیس بھی پکڑ کر مسجد لائے جاتے تھے، سزا کے ڈر سے تمام لوگ بازاروں میں نماز سیکھتے پھرتے تھے، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں علما رومشائخ کو بڑا عروج حاصل ہوا، اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ عام طور سے اس کی حکومت مذہبی حکومت سمجھی جاتی ہے، خواہ یہ حقیقت نہ رہی ہو، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو زر بیت المال میں جمع کیا جائے وہ شریعت محمدی کے مطابق وصول شدہ ہونا چاہئے جن ٹیکسوں کی وصولی قرآن و حدیث کے مطابق نہ ہو ان کو کسی صورت میں بھی بیت المال میں جمع نہ کیا جائے، خود فیروز شاہ کو اسلامی فقہ پر بڑا عبور تھا، اور اس نے فتاوائے فیروز شاہی تدوین کرائی تھی، لیکن اسی زمانہ میں فتاوائے تاتارخانیہ بھی مرتب ہوئی جس کے سامنے فتاوائے فیروز شاہی دب کر رہ گئی،

لودی خاندان کے حکمرانوں میں سکندر لودی کا مذہبی شغف تو مورخین کے بیان کے مطابق حد افراط تک پہنچ گیا تھا، اس کی تہجد اور اشراق کی نمازیں کبھی فوت نہیں ہوئیں، علماء سے اس کی عقیدت کا ثبوت اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار وہ مولانا عبد اللہ سلطانپوری کے ساتھ کہیں جا رہا تھا، ایک مست ہاتھی کہیں سے آتا دکھائی دیا، سکندر لودی نے اپنے کو آگے اور مولانا عبد اللہ سلطانپوری کو پیچھے کر دیا، مولانا نے سلطان سے کہا کہ کہیں تخت و تاج ایک بادشاہ سے محروم نہ ہو جائے، سلطان نے جواب دیا، کہ تخت و تاج تو ایک بادشاہ کو مل جائے گا، لیکن مولانا عبد اللہ سلطانپوری

Marfat.com

پھر نہ پیدا ہوں گے،

سلاطینِ دہلی کی اکثریت شاہانِ مغلیہ کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی رہی، وہ اپنے مذہب کو ہر حیثیت سے بلند و برتر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اسلام کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط نہ ہوتیں، ان کے درباروں میں ہندو اور غیر حنفی امراء کا اقتدار بھی نہ تھا، اس لیے ان کو حنفی فقہ کو رواج دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، مغل حکمرانوں کے دور تک فاتح اور مفتوح کی اجنبیت اور دوری کم ہوتی گئی اس لئے اُن میں موانست اور یگانگت پیدا ہونے کے ساتھ ہی رواداری کا ہونا لازمی تھا، لیکن اس رواداری کے باوجود ان میں مذہبیت بھی رہی جو یقیناً علماء کے اثر سے پیدا ہوئی،

مغل حکمرانوں کی مذہبیت، شاہانِ مغلیہ میں بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا، اس نے ترکی زبان میں اپنے لڑکے کامران کیلئے ایک مثنوی مبین لکھی، جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، یہ کتاب فقہ بابری کے نام سے بھی مشہور ہوئی، وہ خواجہ عبداللہ احراری کا مرید بھی تھا، اور علم معقول اور منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام، مولانا سیف الدین احمد، علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدردان اور معترف رہا،

ہمایوں صوم و صلوٰۃ کا پابند رہا، وہ کبھی قسم نہ کھاتا، معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھتا، اور بے وضو اللہ تعالےٰ کا نام نہ لیتا،

جہانگیر ایک راجپوت شہزادی کا فرزند اور متعدد راجپوت شہزادیوں کا شوہر تھا،

Marfat.com

لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ وہ علما کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر رہا، ایک بار وہ ابوالفضل سے ملنے گیا، دیکھا کہ اس کے گھر پر بہت سے کاتب کلام پاک اور تفسیر کی کتابت کرنے میں مشغول ہیں، ابوالفضل ہی نے اکبر کو یہ یقین دلایا تھا، قرآن مجید الہامی کلام نہیں بلکہ کلام رسول ہے، جہانگیر اپنے باپ کی گمراہی کا سبب ابوالفضل ہی کو قرار دیتا تھا، اس لیے وہ کاتبوں سے لیکر تمام اوراق اکبر کے پاس لے گیا اور کہا کہ ابوالفضل کا مذہب خلوت میں کچھ اور رہے، اور جلوت میں کچھ اور، اور اپنی تزک میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کرانے میں اس کے مذہبی جذبہ کو بھی بڑا دخل تھا، جہانگیر کے تعلقات حضرت مجددؒ سے شروع میں ضرور خراب رہے، لیکن جب اچھے ہوگئے تو وہ روزانہ ان سے مغرب کے بعد ملاقات کرتا، ان ملاقاتوں سے اسکے قلب کی تطہیر جس طرح ہوئی ہے، اس کا اعتراف حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے،

شاہجہاں اہم عہدہ داروں کے تقرر میں ایسے افراد کو ترجیح دیتا تھا جو عالم بھی ہوتے تھے، اس کے دیوان کل افضل خاں شکراللہ شیرازی کا شمار جید علما، میں کیا جاتا تھا، اس کے وزیر سعداللہ خاں کو عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں علامۃ الوریٰ اور فہامۃ العصر لکھتا ہے، وہ معقولات اور منقولات کے ممتاز عالم اور حافظ قرآن بھی تھے، اسی عہد میں دانشمند خان میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھے، ان کا علم معقولات اور منقولات دونوں میں گہرا تھا، انھوں نے اس زمانہ کے سب سے جید عالم ملا عبدالکریم سیالکوٹی سے ایک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر پر علمی مذاکرہ کیا، تو علامہ سعداللہ نے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کا علم زیادہ گہرا اور وسیع ہے،

Marfat.com

شاہجہاں کو اس کا دکھ ہوتا اگر ہندوستان کے علمار کی علمی شان پر کوئی حرف آجاتا، ایک بار اس کی طرف سے کچھ علمار عراق گئے، وہاں ان سے پوچھا گیا کہ امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ قدم علم اور نفیِ علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابونصر فارابی اور ابوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے؟ علمار نے اس کا جواب دینے سے پہلے شاہجہاں کو اس کی اطلاع دی، اس کی حمیت ابھر آئی، اس کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں اس کے وطن کے علمار کی سبکی نہ ہو، اس لیے اس نے اس کے جواب میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے ایک رسالہ لکھوا کر عراق بھیجا،

اسی طرح اس کے عہد میں ایک نابینا عالم اکنج نامی شاہ ایران کے سفیر بن کر اس کے دربار میں آئے، ان کو علوم عقلی و نقلی میں بڑی مہارت تھی، انھوں نے دربار کے علمار سے مناظرہ کیا، ان کی قوتِ گویائی کے سامنے ہندوستانی علمار ٹک نہ سکے، شاہجہان کو اس کا دکھ ہوا، اس نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں سے مشورہ کیا کہ کس عالم کو بلا کر ان سے مقابلہ کرایا جائے، انھوں نے ملا محمود جونپوری کو بلانے کی تجویز پیش کی، بادشاہ نے ناظم جونپور کے نام حکم بھیجا، ملا محمود بڑی منت و سماجت کے بعد اپنے گوشۂ عافیت سے نکلنے کے لئے تیار ہوئے، ناظم جونپور نے ان کو بڑی شان و شوکت سے روانہ کیا، دارالسلطنت کے قریب سعد اللہ خاں اور آصف خان نے ان کا خیر مقدم کیا، دربار میں ایرانی اور ہندوستانی عالم کی ملاقات ہوئی، اور ہیولیٰ پر مناظرہ ہوا، ملا محمود جونپوری نے اپنے تبحر علمی کا ایسا ثبوت دیا کہ ایرانی عالم نے اپنی شکست تسلیم کر کے ان کے ہاتھ چومے، اور شاہجہاں نے خوش ہو کر طشت میں بھر کر ان پر سے چاندی اور سونا نچھاور کیا اور اپنے لڑکے محمد شجاع کو ان کی

شاگردی میں دیا، اور جون پور میں ان کے مدرسہ کے لیے جاگیر عطا کی،

اورنگ زیب تو سراسر علماء کے زیر اثر رہا، اور ان کی ہدایتوں کے مطابق اس نے دربار کا رنگ ہی بدل دیا، تمام غیر شرعی اور ناجائز ٹیکس اور نذرانے بند کرادیے جن کی آمدنی کروروں سے زیادہ تھی، درشن کا غیر اسلامی طریقہ موقوف کیا، شاہ جہان نے دربار میں سجدہ تو بند کرادیا تھا، لیکن زمیں بوسی کی رسم جاری تھی، عالمگیر نے اس کو بھی بند کر دیا، اس نے خورد و نوش، لباس و پوشاک، سیر و سفر کے تمام تکلفات روک دیے، یہانتک کہ دربار میں چاندی کی دوات کے بجائے چینی کی دوات رکھنے کا حکم دیا، انعام کی رقمیں چاندی کی کشتیوں کے بجائے سپر میں پیش کیجانے لگیں، زربفت وغیرہ کے خلعت موقوف کر دیے گئے، گانا بجانا دربار میں رک گیا، تمام اضلاع میں محتسب مقرر کیے گیے، جو لوگوں کو منہیات اور ممنوعات سے باز رکھتے تھے، مسجدوں میں امام، موذن، خطیب مقرر کیے گئے، فتاویٰ عالمگیری جیسی جامع کتاب کی تدوین ہوئی، ان تمام باتوں پر خواہ پورا عمل نہ ہو سکا ہو، لیکن عالمگیر نے دربار اور اپنے ہم مذہبوں کے مزاج کو اسلامی بنانے کی پوری کوشش کی، عالمگیر کی یہ ہمت و عزیمت اپنی جگہ پر قابل تعریف ضرور ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس سے اس کے دربار کے امراء کی زندگی میں کوئی خاص انقلاب پیدا نہ ہو سکا، وہ امارت پسندی، جاہ طلبی اور دنیاداری اور نفاق پروری میں کچھ ایسے مبتلا ہو گئے تھے، کہ ان کو دین داری کی طرف مائل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، ان ہی کی معاشرتی زندگی کی تقلید عام مسلمان بھی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لیے ان کی زندگی میں بھی خاطر خواہ اسلامی رنگ نہ پیدا ہو سکا، البتہ عالمگیر کی وجہ سے خواص و عوام میں غیر شعوری

Marfat.com

طور پر اس کا احساس ضرور پیدا ہوا کہ وہ اسلامی زندگی سے دور ہو گئے ہیں، اور ان کی زندگی بڑی حد تک بگڑ چکی ہے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے پوری زندگی سنور سکتی ہے اور یہ احساس عام مسلمانوں میں قائم رہا، البتہ عالمگیر نے مسلمانوں کے جس ذہن کو جھنجھوڑا تھا اس سے علمار کو خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہیے تھا لیکن اس سے فائدہ اٹھانے میں بڑی تاخیر کی،

مفاد پرست علماء، دربار کے کچھ علمار ایسے بھی ضرور تھے جو اپنے عہد کے فرمانرواؤں کو ظل اللہ فی العلمین، ظل یزدانی، ظل اللہ فی الارض، سایۂ یزدان پاک اور دین پناہ کے القاب سے یاد کرنے میں بھی تامل نہ کرتے تھے، اور یہ القاب ایسے حکمرانوں کے لیے بھی استعمال ہوتے جن کی نجی زندگی بہت خراب ہوتی، اور ان کی اطاعت کو بھی مذہبی فریضہ قرار دیا جاتا، اور ان کے باغیوں کو عاصی ٹھہرایا جاتا، اور وہ کبھی کبھی ایسے فتاوے دیدیتے جن سے دربار میں غیر شرعی مراسم رواج پاتے، مثلاً سلاطین دہلی کے زمانہ میں کچھ علماء ایسے تھے، جو تخت کے سامنے زمیں بوسی کو جائز سمجھتے تھے، اکبری عہد کے بعض علماء نے اکبر کو قبلۂ حاجات اور کعبۂ مرادات بنایا اور اس کے سامنے سجدۂ تعظیمی کرنا ضروری قرار دیا،

ایسے علماء کو حکمران اپنے مفاد کے لیے استعمال تو کرتے رہتے، اور وہ بھی حب جاہ کی خاطر استعمال ہوتے رہتے، لیکن عام نگاہوں میں ان کی قدر و منزلت کبھی نہیں ہوئی، مولانا ضیاء الدین برنی نے ایسے علماء کو "مرتد صفتان کافر" کہا ہے، سلطان غیاث الدین بلبن ان کو پاؤں چلے کتے سے تشبیہ دی ہے، وہ کہتا تھا کہ سمجھدار اور دیندار بادشاہ وہ ہے جو علمائے دنیا کے کہنے پر عمل نہ کرے، بلکہ شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا نفاذ ان علمار کے حوالہ کرے، جنھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہو اور جن کی نظر میں روپیے

Marfat.com

سانپ اور بچھو کی حیثیت رکھتے ہوں (حضرت مجدد الف ثانیؒ ایسے علما رکو علما ے سو رسے یاد کرتے ہیں) اور انہی جیسے علما ء کے لیے یہ لطیفہ بھی لکھا ہے کہ ایک بزرگ نے ابلیس کو بے کار بیٹھے دیکھکر اس کی وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ اس زمانہ کے علما ء میرا کام انجام دے رہے ہیں")

ایسے علما ء دربار سے وابستہ ہونے کے بعد اپنے میں امارت کی پوری شان بھی پیدا کر لیتے تھے عہد اکبری میں مولانا عبداللہ سلطانپوری کا انتقال ہوا، تو ان کے ذاتی خزانہ سے تین کرور روپیے نکلے، اسی عہد کے صدر جہان اور مفتی مولانا میر عبدالحیٰ تو پیالہ کش بھی ہوگئے تھے، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے سلسلہ میں جو علما ء مقرر ہوئے تھے، ان کے سربراہ شیخ نظام برہانپوری تھے، عالمگیر نے ان کو مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کر کے شش ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب عطا کیا تھا، اور ان کے دروازے پر عربی اور عراقی گھوڑے اور ہاتھی جھومتے تھے، عہد عالمگیری میں گجرات کے قاضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب کی دولت کی وجہ سے امرا بھی ان سے حسد کرتے تھے، ایک بار ایک حاسد امیر نے ان کے تین لاکھ روپیے راستے میں لٹوا دیے اور جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے چاروں لڑکوں کو دو دو لاکھ روپیے ملے،

جری علما ء | لیکن سب علما ء ایسے نہ تھے، بلکہ ان ہی میں کچھ ایسے بھی تھے جو بادشاہوں کو ان کی لغزشوں پر علانیہ ٹوکتے تھے، مولانا سید نورالدین مبارک غزنوی ایلتمش کے عہد میں شیخ الاسلام تھے، انھوں نے التمش کے سامنے ایک وعظ میں فرمایا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طریقہ سے وہ کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور سواری کرتے ہیں، تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو اپنے سامنے بٹھاتے اور سجدے کراتے ہیں، خدا کے باغی حکمرانوں کے مراسم کی رعایت دل و جان سے

کرتے ہیں، اور خدا کے معاملات میں جدت اختیار کرتے ہیں، یہ سب دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، شرک اور عقبیٰ میں موجبِ سزا ہیں، اسی وعظ میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ بادشاہوں کی نجات ان چار چیزوں پر موقوف ہے؛

(۱) اسلام کی حمیت کو برقرار رکھیں، اور بادشاہت کے قہر و سطوت اور عز و ناز کو شعار اسلام کے بلند کرنے میں صرف کریں،

(۲) دین کی حمایت یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی شہروں اور قصبوں سے فسق و فجور، گناہ و معصیت کو قہر و سطوت کے ذریعہ بالکل ختم کر دیں،

(۳) دین کی حمایت اس طرح ہو سکتی ہے کہ دین محمدی کے احکام کی اشاعت کے لیے اہل تقوی زاہد، خداترس اور دیندار لوگ مقرر کیے جائیں، بد دیانتوں، دھوکے بازوں، حیلہ گروں، دنیا کے عاشقوں اور فریب دینے والوں کو مسند حکومت پر نہ بٹھایا جائے

(۴) دین کی حمایت، عدل گستری اور انصاف پروری میں بھی ہے، بادشاہ عدل اور انصاف میں انتہا پسند ہو، ظلم و تعدی اس کے ملک میں مطلق نہ ہو، جب وہ قہر، قوت اور سطوت سے ظالموں کے ظلم کو دور نہ کرے گا، عدل پروری کا حق نہیں ادا کر سکتا،

آخر میں مولانا نے فرمایا کہ اگر بادشاہ روزانہ ہزار رکعتیں پڑھتا، تمام عمر روزے رکھتا اور گناہوں سے بچتا اور خزانہ کو راہ حق میں خرچ کرتا رہے، مگر دین کی حمایت نہ کرے اپنی سطوت کو خدا اور رسول کے دشمنوں کے قلع قمع کرنے میں صرف نہ کرتا ہو اپنے ملک میں امر معروف کو جاری کرانے اور منکر کو مٹانے میں کوشاں نہ رہتا ہو، اور عدل و انصاف سے کام نہ لیتا ہو، تو اس کی جگہ دوزخ کے سوا اور کہیں نہیں ہوگی۔

علاء الدین خلجی درشتی کے لیے مشہور تھا، لیکن جب اپنے ایک درباری عالم

قاضی مغیث الدین سے اس نے بعض مسائل پر فقہی و شرعی استفسارات کیے تو انھوں نے بڑی بے باکی اور جرأت سے جوابات دیے، یہ سب جواب صحیح تھے، یا غلط، اس سے اس وقت بحث نہیں، لیکن انھوں نے بڑی صفائی سے کہا کہ اگر بیت المال سے اس نے اپنے حق سے زیادہ لیا اور لاکھوں اور کروڑوں دام سونے کی اور جڑاؤ چیزیں خاص حرم کو دینا شروع کر دیں تو قیامت میں ان سب کی باز پرس ہوگی، بادشاہ خواہ اسی لمحے میرے دو ٹکڑے کر دے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اپنے سپاہیوں، شراب پینے والوں اور تاجروں کو جو سزائیں دیتا ہے وہ سب نامشروع ہیں،

سلطان محمد تغلق کے عہد میں شیخ شہاب الدین، فقیہ عفیف الدین کاشانی، شیخ ہود، شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین، اور شیخ حیدری وغیرہ تو اسی لیے قتل کیے گئے کہ انھوں نے سلطان سے اختلاف کیا، اور اس کی ہمنوائی نہیں کی، گو اس کی تفصیل بیان کرنے میں مورخین نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اختلافات کی صحیح نوعیت ظاہر نہیں ہوتی ہے،

سلطان سکندر لودی، کے عہد میں علمار کی جرأت اور زیادہ بڑھی ہوئی تھی، سکندر لودی بہار کے دورہ پر گیا تو ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پابندی سے پڑھنے کے لیے جاتا تھا، ایک بار اس کے آنے میں دیر ہوئی تو نماز شروع کر دی گئی، اور سلطان نماز کے بعد پہنچا، مولانا جمالی، ساتھ تھے، انھوں نے لوگوں سے کہا کہ سلطان کا انتظار ضروری تھا، لیکن مولانا ہدی حقانی نے جواب دیا کہ ہم کو اللہ کی نماز پڑھنی تھی، وہ پڑھ لی، سکندر لودی نے کہا کوتاہی میری ہے، اچھا کیا کہ نماز پڑھ لی،

اسی کے عہد میں کشتر کے ایک تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے اور اشنان کرتے تھے،

سکندر نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کر کے اس اجتماع کو روک دے، اس زمانہ کے ایک عالم مولانا عبداللہ سے استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کو روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں، سکندر کو یہ جواب پسند نہیں آیا، وہ سمجھا کہ یہ طرفداری کا فتویٰ ہے، اور اپنی برہمی کا اظہار کیا، لیکن انھوں نے بڑی جرأت اور صفائی سے فرمایا کہ میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کر دیا ہے، اگر شریعت کی پرواہ نہیں تو پھر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی،

سکندر لودی کے آخر زمانہ میں دہلی کے ایک بزرگ حاجی سید عبدالوہاب بخاری نے سکندر سے داڑھی رکھنے کے لیے اصرار کیا، سکندر کو ناگوار گذرا اور جب وہ چلے گئے تو اس نے کہا یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عظمت ان کی وجہ سے ہے، حالانکہ میں ایک غلام کو عزت دوں تو میرے امرار بھی اُس کی عزت کرنے لگین گے، حاجی عبدالوہاب کو یہ معلوم ہوا تو انھون نے سکندر لودی کے لیے بددعا کی اور کہا جاتا ہے کہ اسی بددعا کی وجہ سے اس کے حلق میں شدید تکلیف پیدا ہوئی، جس سے وہ جانبر نہ ہوسکا،

شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں بھی علمار کی جرأت اور صاف گوئی کی مثالین ملتی ہیں، ملا عبدالنبی اکبر سے اپنی جوتیاں سیدھی کرایا کرتے تھے، ایک دفعہ اُس نے سالگرہ کی تقریب میں اپنے کپڑوں پر زعفرانی رنگ چھڑکا، ملا عبدالنبی اس قدر برہم ہوئے کہ سرِ دربار لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جا کر ماں سے شکایت کی کہ وہ خلوت میں منع کرتے تو کوئی ہرج نہ تھا، دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا بیٹا! دل پر میل نہ لاؤ، یہ نجات اخروی کا باعث ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال ملاّ نے بادشاہ کے ساتھ ایسی حرکت کی، اور سعادتمند بادشاہ نے

Marfat.com

اس کو برداشت کیا۔

اکبر نے دین الہٰی قائم کیا تو جونپور کے قاضی القضاۃ ملا محمد یزدی اور بنگال کے قاضی القضاۃ معز الملک اور قاضی یعقوب نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہوگیا ہے اس پر جہاد واجب ہے، اس اعلان پر تینوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے،

اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو صدر الصدور نے شاہ جہاں کی موجودگی میں اورنگ زیب کا نام خطبہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیا،

اورنگزیب مولانا میر مرتضیٰ واعظ ملتانی کو اس لیے پسند کرتا تھا کہ وہ شرعی اور مذہبی امور میں حق گوئی سے کام لیتے تھے، اسی لیے ان کو شہزادہ کام بخش کی اصلاح و تربیت کے لیے مامور کیا، اسی دور کے ایک عالم شیخ بایزید نے ایک روز جامع مسجد میں تمام لوگوں کے سامنے عالمگیر سے پوچھا کہ اس کی لڑکیوں میں بعض ناکتخدا کیوں ہیں اور شادی کی تلقین کے لیے ایک وعظ کہا، جس کو عالمگیر نے بڑی خاموشی سے سنا،

بعض درباری علماء نے برے نمونے ضرور پیش کیے لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کی تعلیم و تلقین رائگاں نہیں گئی، وہ سلاطین کی نجی اور درباری زندگی کی بعض غیر شرعی باتوں کو دور کرنے میں ضرور ناکام رہے، لیکن یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی عام معاشرتی زندگی میں اسلامی اثرات کو زیادہ سے زیادہ غالب رکھنے میں کامیاب رہے، مغل بادشاہوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر راجپوت خاندانوں میں رشتہ قائم کرنا شروع کیا، لیکن یہ درباری علماء ہی کا اثر تھا کہ راجپوت شاہزادیاں محل میں آتیں تو وہ اپنے اعزہ و اقربا کی خاطر مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان تو نہ کرتیں، لیکن درحقیقت مسلمان بن کر محل میں زندگی بسر کرتیں، چنانچہ جہانگیر کی ماں کا نام مریم زمانی رکھا گیا، شاہجہان

اپنی ماں جگت گسائیں کو بلقیس مکانی کے نام سے یاد کرتا ہے، مرنے کے بعد ان راجپوت شاہزادیوں کو اسلامی طریقہ ہی سے دفن کیا جاتا، ایسی کوئی مثال نہیں کہ ؤ جلائی گئیں یا انھوں نے اپنی کسی اولاد کو ہندو مذہب پر قائم رہنے کیلئے اصرار کیا ہو، اورنگزیب اور اس کے ایک لڑکے کی شادی راجپوت خاندانوں میں بھی ہوئی لیکن وہ نکاح سے پہلے کلمۂ طیبہ پڑھا لینا ضروری سمجھتا تھا،

درباری علما، جیسے بھی رہے ہوں لیکن اگر وہ بھی غیر موثر ہوجاتے تو دربار اسلامی تہذیب اور شعار سے بالکل بیگانہ ہوجاتا، مثلاً جہاندار شاہ اپنی طوائف لال کنور کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا تھا، اس کے ساتھ چاندنی چوک کی دوکانوں میں جاتا، شراب خانہ کی بھی سیر کرتا، محمد شاہ پیا رنگیلے کا دربار تو گویوں اور سازندوں کا مرکز بن گیا تھا، اور جہاں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین ہوئی وہاں خیال اور سارنگی کے ایجاد پر فخر کیا جانے لگا، لیکن اس عہد کا یہ واقعہ بھی لکھنے کے لائق ہے کہ محمد شاہ نے اپنی ایک خاص مجلس میں اپنے قاضی القضاۃ کی تحقیر کی، لوگوں نے قاضی کو شرم اور غیرت دلائی، قاضی صاحب نے جواب دیا کہ قضا کے فیصلوں میں بادشاہ میرا قلم نہیں روکتا اس لیے مسلمانوں کے فائدے کی خاطر میں اپنی شخصی ہتک گوارا کر لیتا ہوں،

فتنۂ اباحت | جب کسی مسئلہ پر علما، اور سلاطین کا تعاون ہوجاتا تو دونوں کی متحدہ قوتوں سے اہم سے اہم کام کسی پیچیدگی کے بغیر انجام پا جاتا اور مذہبی گمراہی اور سیاسی شورش بھی آسانی سے ختم ہوجاتی، مثلاً فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اباحیتوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا، جس کے افراد ایک مقررہ جگہ جمع ہوتے، شراب پیتے، اپنی عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لاتے اور جو جس کا دامن پکڑ لیتا اُس سے ملوث بھی ہوتا، اور ان خرافات کو یہ گروہ مذہبی عبادت

Marfat.com

کہتا تھا، علما رنے اس کو ملحد اور گمراہ قرار دیا، اور سلطان فیروز شاہ تغلق نے ان کو سخت سزائیں دیں، ان میں سے بعض کو قتل کرا دیا اور بعض کو قید میں ڈال دیا، اور بعض کو جلاد وطن کر دیا،

فتنۂ مہدیت | اسی طرح اس عہد میں دہلی کے ایک باشندہ رکن الدین نے مہدیت کا دعویٰ کیا، علما رنے اس کے خلاف شورش کی تو فیروز شاہ تغلق نے اُس کو قتل کرا دیا،

نویں صدی ہجری میں سید محمد جونپوری بھی مہدویت کے مدعی ہوئے اور اُن کا اثر کچھ پھیلا تو علما رنے ان کے خلاف بھی شورش کی اور ارباب حکومت کی مدد سے ان کو کہیں چین لینے نہیں دیا، اس لیے کبھی دانا پور، کبھی چندیری، مانڈو، چمپانیر، احمد نگر، گلبرگہ، احمد آباد اور نہر والہ میں قیام کیا، لیکن وہ کہیں ٹکنے نہ پائے، یہانتک کہ ان کو ہندوستان بھی چھوڑنا پڑا، اصلاح رسوم اور بدعات کے استیصال میں اُن کی خدمات مشہور ہیں اس لیے ان کے بارے میں مختلف رائیں ہیں، کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ان کے دعوئے مہدیت کا مقصد صرف احیاے سنت تھا، لیکن اُن کے معاصر علمار ان کے مخالف رہے اور گو ہندوستان میں ان کے کچھ پیرو اب بھی باقی ہیں، لیکن وہ کوئی موثر قوت نہیں ہیں،

فرقہ روشنیہ | اسی طرح عہد اکبری میں بایزید روشن جالندھری نے نبوت کا دعویٰ کیا، ہندی اور پشتو میں رسالے بھی لکھے اور اپنی کتاب کلام البیان کو کلام الٰہی بتایا، علما رسے بڑے بڑے مناظرے بھی کیے، لیکن علما بازی نہ لے جا سکے، اور ایک مستقل فرقہ روشنیہ کے نام سے قائم ہوگیا، اس فرقہ کا اثر سرحد کے قبائلی علاقہ میں زیادہ پھیلا، بایزید روشن کو کابل میں اکبر کے حاکم محسن خان نے گرفتار کرکے قید کر دیا، لیکن رہائی کے بعد بایزید روشن نے

Marfat.com

آفریدی قبیلہ میں اپنی سرگرمی اور تیز کر دی اور مغلوں کو افغانی حکومت کا غاصب بتا کر اکبر کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، اکبر کو فرقہ روشنیہ کے خلاف فوج کشی بھی کرنی پڑی، لیکن اس کی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں اور روشن کی وفات کے بعد ہی مغل حکومت اس فرقہ کو قابو میں لا سکی۔

جہانگیری عہد کی بعض مذہبی گمراہیاں

جہانگیر کو عام طور سے رند بلانوش سمجھا جاتا ہے، لیکن مذہبی گمراہی کے خلاف اس کی مذہبی حمیت جوش میں آتی رہی، اس کے عہد میں لاہور میں شیخ ابراہیم نے اپنے ارد گرد افغانوں کو جمع کر کے مذہبی گمراہی، اوباشی اور سفلہ پروری پھیلائی، تو علماء کے توجہ دلانے پر جہانگیر نے اس کو چنار میں قید کر دیا۔

شاہجہانی اصلاح

علماء ہی کی کوشش سے شاہجہانی عہد میں اللہ اور رسول کے ساتھ گستاخی کرنے کی سزا مقرر ہوئی اور انہی نے ان عورتوں کو جو غیر مسلموں کی زوجیت میں آگئی تھیں ان سے چھٹکارا دلایا اور جو مسجدیں شہید کر کے مندر بنا دی گئی تھیں، ان کو واگذاشت کرایا، اس نے علماء ہی کے اثر سے شراب سازی اور شراب نوشی کی بھی ممانعت کرا دی تھی مگر یہ مکمل طریقہ سے بند نہ ہو سکی،

فتنۂ فربودی

جب علماء اور فرمانروایان وقت کمزور پڑ جاتے تو مذہبی فتنہ کو روکنا مشکل ہو جاتا، مثلاً مغلوں کے آخری دور حکومت میں میر محمد حسین رضوی مشہدی نے دعویٰ کیا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اور جس روز اس کے دعویٰ کے مطابق اس پر پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تھی، اس روز اس کے تمام پیرو جمع ہوتے، خوشیاں مناتے، خوشبو اور عبیر ایک دوسرے پر چھڑکتے، خود میر حسین اپنے پیرووں کو اس جگہ لیجاتا جہاں اس کے گمان میں اس پر وحی نازل ہوئی تھی، اس کو اس کے پیرو قبلۂ حاجات اور گہوارۂ سعادت

Marfat.com

سمجھتے، اس نے اپنا لقب "فر بود لمود اللہ" اور "لمود و المود" رکھ لیا تھا، اس لیے اس کی تحریک فربودی کہلانے لگی، اس نے یہ تماشا پہلے لاہور میں شروع کیا، پھر دہلی منتقل ہو گیا، فرخ سیر اس کا بڑا معتقد ہو گیا، اور اس کے ماننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی، عام علما نے اس کے خلاف شورش کی، لیکن بڑے علمار نے اس کو ایک بازی گر سمجھکر اس سے الجھنا پسند نہیں کیا، کم سواد علمار مناظرے میں اُس سے مغلوب ہو جاتے، جس سے عوام اس کے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے، فرخ سیر کے انتقال کے بعد محمد شاہ کے وزیر محمد امین خاں نے اس پر سختی شروع کی، لیکن جس روز اس نے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کیا، اسی روز وہ درد قولنج میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہو گیا، عوام اس کو فربودی کرامت سمجھے، اس لیے اس کی بزرگی کی شہرت اور بڑھ گئی، علمار برابر عوام کو اس کے فتنہ سے بچانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن ان کی خوش اعتقادی اس کی وفات تک قائم رہی، اس کے بعد اس کے خلفار میں جھگڑے شروع ہو گئے، ان سے جو راز منکشف ہوئے اُس سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ جو کچھ تھا محض ایک دلچسپ سوانگ تھا،

سلاطین کے ناقد علمار، ابتک علمار کی تین قسموں کا بیان ہوا ہے، چوتھی قسم میں وہ علمار تھے جو برابر مسلمان حکمرانوں کے ناقد رہے اور ان کی تنقیدیں اس لحاظ سے صحیح تھیں کہ ان مسلمان فرمانرواؤں میں بعض ایسے بھی تھے جن کی مجلسوں میں بادہ و ساغر کا دور چلتا تھا، بعض کے یہاں ازدواج کی تعداد کی کوئی قید نہ تھی، بعض کے درباروں میں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں، گویوں اور سازندوں کی بڑی سرپرستی کیجاتی تھی، اور شاہانہ شوکت و تجمل کے اظہار میں کوئی کسر باقی نہ رکھی جاتی تھی، غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد میں قلعہ کے اندر ایک محل بنوایا تھا، جس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا، اسمیں

Marfat.com

ایک حوض بھی تھا، جس کو سیال سونے سے بھروا دیا گیا تھا، شاہی محل کے اندر جو غسل خانہ تھا وہ بھی سونے کا تھا، اسی طرح لال قلعہ کے اندر شاہجہان نے زنانہ محل کی چھت خالص چاندی کی بنوائی تھی، کھانے کے ظروف، ساغر، مینا، صراحی، پاندان، خاصدان سنگار دان وغیرہ سونے کے ہی ہوتے، اور عام طور سے لباس و پوشاک میں اتنے جواہرات جڑے ہوتے کہ بعض اوقات کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا، مغل بادشاہ تو زیور بھی استعمال کرنے لگے تھے، ان کے گلے میں موتیوں کے ہار اور بازوؤں میں بازو بند ہوتے، ان کی پگڑیوں میں موتیوں کا طرہ، جیغہ (ایک مرصع زیور) سرپیچ (ایک جڑاؤ زیور) اور کلغی ہوتی، شاہجہاں کے سرپیچ کی مجموعی قیمت بارہ لاکھ روپے تھی، اورنگزیب کے عمامہ میں بھی ہیرے اور زمرد ہوتے، اسی طرح تہوار اور شادی بیاہ کے موقع پر جو تقریبات منائی جاتیں اُن میں مسرفانہ تکلفات مشرکانہ حد تک پہنچ جاتے،

شاہانہ تکلفات علماء ان تمام تکلفات کو رسومِ جبابرہ میں شمار کرتے اور احکامِ الٰہی اور سنّت نبوی ؐ کے خلاف سمجھتے، ایسے علماء ہندوستان میں بھی عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے دور کا اسلام دیکھنا چاہتے تھے، اسی لیے وہ یہاں کے مسلمان سلاطین، امراء اور عوام کی زندگی کو غیر اسلامی آلائشوں اور آمیزشوں سے پاک وصاف دیکھنے کی آرزو کرتے رہے، کچھ سلاطین ایسے ضرور گذرے ہیں جنھوں نے اپنے دربار سے خود پرستی اور خود نمائی ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن زیادہ تر غیر اسلامی قسم کی عظمت نمائی میں مبتلا رہے، جس کو انھوں نے قصداً اور مصلحۃً بھی اختیار کیا تھا، بلبن ہندوستان کے ماحول کو دیکھ کر، اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ جو بادشاہ دربار کی آرائش، شاہانہ سواری کے مراسم اور سلطنت کے آداب کا لحاظ نہیں کرتا اس کا رعب و داب رعیت کے

Marfat.com

دلوں میں قائم نہیں ہوتا، اور نہ دیکھنے والوں پر اس کی عظمت وجلالت کا کچھ اثر ہوتا ہے، ایسے بادشاہ کے دشمن اس پر دلیر ہو جاتے ہیں اور اس کی حکومت میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلبن کا قول تھا کہ بادشاہ کا رعب اور اس کی ہیبت جس قدر اس کے وقار وتمکنت سے رعایا کے دلوں میں بیٹھتی ہے، اس قدر سزا اور خشونت سے قائم نہیں ہوتی' وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ کا پُرہیبت اور پُرجلال نہ ہونا رعایا کی سرکشی اور بغاوت کا باعث ہوتا ہے، ایسی حالت میں غیر مسلم باغیانہ روش اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان فسق وفجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور عدل وانصاف میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے، اور ظلم وتعدی کے دروازے کھل جاتے ہیں، بلبن اس کا بھی قائل تھا کہ اگر بادشاہ باہیبت اور بارعب نہیں تو اس سے دین حق کی رسوائی ہوتی ہے، اور دوسرے ادیان میں رونق آجاتی ہے،

ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان فرمانروا اسی شاہانہ حشمت ودبدبہ پر عمل پیرا رہے، اورنگ زیب نے درباری اور خانگی زندگی میں سادگی اختیار کرنے کی ضرور کوشش کی، لیکن وہ بھی جب کسی مہم پر جاتا تو اس کے کیمپ کے ساتھ اُس کے حرم کی بیگمات کے لباس وپوشاک وجواہرات ستر اسی اونٹوں اور ہاتھیوں پر بار ہوتے، کیمپ کے اندر حرم سرائیں' ایرانی قالین، مشجر فرش اور منقش پردے ہوتے، فرنگی مخمل، ساٹن چینی، ریشمی اور زردوزی کے کپڑوں سے آراستہ ہوتیں، اور دوسرے بادشاہوں کے کیمپ میں تو آبدار خانہ، تنبول خانہ، میوہ خانہ، رکاب خانہ، توشک خانہ، خوشبو خانہ اور خدا جانے کیا کیا ہوتا ، میدانِ جنگ کی لڑائیوں میں بھی دیبا، حریر، زربفت اور مخمل وغیرہ کی آنکھیں خیرہ کر دینے والی زینت وآرایش ہوتی،

ان تکلفات سے شاہانہ رعب تو ضرور قائم ہوتا، لیکن آگے چل کر یہ نمود ونمایش

Marfat.com

سلطنت کا نصب العین بن کر رہ گئی تھی، جس نے اخلاقی زندگی کو بالکل کھوکھلا کر دیا، امراء، سلاطین کی پُر تکلف زندگی کی نقالی کرنے کی کوشش کرتے اور امارت کے ساتھ جس قدر دولت کی فراوانی ہوتی گئی اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ پیدا ہوتی گئیں، اور جب ان کے اچھے اوصاف زائل ہو گئے تو ان کا کردار بھی بگڑ گیا، شاہ ولی اللہ صاحب... بڑے دکھ اور درد سے اپنے عہد کے امراء کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں،

"اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے اُن کو تم نے چھوڑ دیا، .... کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے' اور پھر اپنے فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے' تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لیے کھڑے کیے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں جوا کھیلا جائے، لیکن اس میں دخل نہیں دیتے، اور اس حال کو نہیں بدلتے،.. جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو تمہاری ساری ذہنی توانائی اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانے کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکاتے ہو، خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصہ کہانیوں میں اس کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے، کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے، یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے"

لیکن اسی کے ساتھ تاریخ کا یہ پہلو بھی دردناک ہے کہ گو علماء سلاطین اور امراء کی زندگی کو غیر اسلامی اور غیر شرعی بتاتے رہے، مگر ان کی زندگی کو اسلام اور شریعت سے قریب تر کرنے کی کوئی اجتماعی کوشش نہیں کی وہ کرھتے ضرور رہے لیکن لسانی جہاد اور تیغ زبان ہی کے استعمال کرنے پر اکتفا کیا، مثلاً مولانا ضیاء الدین برنی اور ان کے ہمنوا علماء کو بڑا دکھ تھا کہ سلاطین دہلی کی حکومت اسلامی نہیں، اور انکا طرز عمل شریعت کی روشنی میں قابل معافی نہیں، لیکن فتاواے جہانداری میں انھوں نے جو بحث کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کو جن پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کو سلجھانے میں اس زمانہ کے علما کی اجتہادی فکر کوئی کام نہ کر سکی، اور مولانا ضیاء الدین برنی یہ کہکر خاموش ہو گئے ہیں کہ دینداری اور حکومت کی دنیاداری ساتھ نہیں چل سکتی،

ہر زمانہ میں تخت کی جانشینی کے لیے ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں، جن میں نہ صرف جانباز، آزمودہ کار اور لائق فوجی مارے جاتے بلکہ اس سے ملک کی سیاسی اور معاشی حالت بھی اتنی بگڑ جاتی کہ پوری سلطنت خطرے میں آجاتی، علماء سماع کے جائز و ناجائز، زعفرانی رنگ کے زرد کپڑوں کے حلال و حرام، اطلس کے مشروع اور نامشروع ہونے پر جھگڑتے رہے، لیکن اپنی مجتہدانہ فکر سے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ کم از کم جانشینی کے اصول و ضوابط مرتب ہو جائیں، جن پر عمل ہوتا رہے، وہ برابر اس کی تبلیغ کرتے رہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو علٰحدہ چیزیں نہیں ہیں، لیکن دونوں کی تطبیق میں ان کی طرف سے کوئی عملی کوشش نہیں ہوئی، ہندوستان میں مسلمانوں کا دور ساڑھے چھ سو برس رہا، لیکن اس دور میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ علماء نے اجماع کے

Marfat.com

ذریعہ سے یہاں کے مسائل کو طے کرنے کی کوشش کی ہو بعض مسلمان فرمانرواؤں کی خواہش ضرور ہوئی کہ ان کی حکومت اسلامی طرز کی ہو لیکن ان کی خواہش عمل میں اس لیے نہیں آسکی کہ اُن کے ذہن میں اسلامی حکومت کا واضح اور صاف تصور نہ آسکا، خلافتِ راشدہ کی مثال ضرور تھی، لیکن ایک ایسے اسلامی طرز حکومت کا کوئی نمونہ نہ تھا جہاں کی اکثریت .. غیر مسلموں کی ہو، اور علماء نے اس کا کوئی واضح اور مرتب خاکہ پیش کرکے اُن کی مدد بھی نہیں کی، اسی لیے خاندانی بادشاہت قائم رہی اور چلتی رہی،

علماء کی نااتفاقی سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ خود علماء میں اتفاق رائے مشکل سے ہوتا تھا، اس لئے اگر وہ چاہتے بھی تو شاید متفقہ طور پر کوئی باضابطہ سیاسی نظام پیش نہیں کرسکتے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جب جہانگیر کو اپنی حکومت میں اصلاح کرنے کے لیے مجبور کیا تو اس نے حکم دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں اور ان کے مشورے سے ملکی نظم و نسق ایسا قائم کیا جائے کہ کوئی حکم خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہ سنکر حضرت مجددؒ نے چار کے بجائے صرف ایک عالم کے منتخب کرنے کی تجویز پیش کی اور اس کا یہ سبب بیان کیا :-

"اگر علماء میں منصب اور عزت کی خواہش ہوئی تو ہر ایک اپنی طرف کھینچنا چاہے گا اور اپنی بڑائی جتانے کی کوشش کرے گا، اور پھر ان میں اختلاف ہوں گے، اور ان ہی کو یہ تقرب بادشاہی کا ذریعہ بنائیں گے، اور لامحالہ مشکل پیدا ہوجائے گی، دورِ سابق میں علماءِ سوء ہی کے اختلافات نے دنیا کو بلا میں ڈالا تھا، اور اب وہی چیز پھر درپیش ہے دین کی ترویج کہاں، کہیں پھر تخریب نہ ہو، العیاذ باللہ اگر بجائے چار کے ایک ہی عالم کو اس لیے انتخاب کریں تو بہتر ہے، اگر علماءِ ربانی میں سے مل جائیں تو کیا کہنا، ان کی صحبت تو کبریت احمر ہے"!

دین الٰہی | حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جن علماء سوء کا ذکر کیا ہے، اُن سے ہندوستان میں اسلام کو بڑا نقصان پہنچا، اکبر شروع میں بڑا دیندار تھا، وہ سفر و حضر میں نماز باجماعت کبھی ترک نہ کرتا تھا، دربار میں نماز کے اوقات میں جماعت کھڑی کراتا، آبادی سے دور جاکر مراقبہ بھی کرتا، فتح پور سیکری میں جو عبادت خانہ بنوایا، اس میں علماء کو بلاتا، اور ان سے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتا، اور جمعہ کی ساری رات علماء و مشائخ کی صحبت میں گذارتا لیکن ملا عبدالقادر جیسے راسخ العقیدہ مسلمان مورخ کا بیان ہے کہ اسی عبادتخانہ میں علماء بادشاہ سے قریب تر بیٹھنے کی خاطر جھگڑتے، بحث و مباحثہ میں ایک دوسرے کی تردید کرتے، اگر ایک عالم کسی چیز کو حرام قرار دیتا تو دوسرا اس کو حلال ثابت کرتا، یہاں تک کہ ایک دوسرے کو گمراہ سمجھنے لگتے، اور جب بحث ہوتی تو ان کی گردن کی رگیں پھول جاتیں اور شور ہونے لگتا، ہلڑ مچ جاتا، ملا عبدالقادر بدایونی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکبر اپنے زمانہ کے علماء کو رازی اور غزالی سے بہتر خیال کرتا تھا، لیکن ان کی رکاکتیں دیکھ کر علمائے سلف کا بھی منکر ہو گیا، اور پھر انہی علماء نے ملا مبارک ناگوری جیسے ذہین اور فہیم عالم کو بھی اپنے سے بیگانہ کر دیا، جس کی وجہ سے ان کا سارا دینی تبحر اکبر کو مجتہد اعظم ثابت کرنے اور ان کے لڑکوں ابوالفضل اور فیضی کی ساری ذہانت اور لیاقت دین الٰہی کی حمایت میں صرف ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر قرآن مجید، حیاتؔ بعد الموت اور یوم جزا کا منکر ہو گیا، اس نے حکم دیا کہ کلمہ کی جگہ "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" پڑھا جائے، شراب اور سور کا گوشت تو حلال کر دیا گیا، لیکن، گائے کا گوشت حرام قرار پایا، حج منسوخ کر دیا گیا، تقویم اسلامی کے بدلے الٰہی ماہ و سال رائج ہو گئے، عربی کے مطالعہ کو تحقیر سے دیکھا جانے لگا، دربار میں نماز باجماعت موقوف کر دی گئی، مساجد

Marfat.com

اور نماز کے کمرے گوداموں میں تبدیل کر دیئے گئے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا سفینہ ہندوستان میں ہمیشہ کے لیے غرقاب ہوجائے گا، لیکن اسلام کی قوتِ نمو نے خود اس کو بچا لیا، اور یہ حضرت مجددؒ کی بڑی دور اندیشی تھی کہ انھوں نے علمائے ربانی اور علمائے سوء کی اصطلاح قائم کر کے عام علماء کے وقار کو محفوظ کر دیا، ورنہ علماء کے وقار کے خاتمہ کے ساتھ اسلام کے وقار کا بھی خاتمہ ہوجاتا،

علماء کی دار وگیر ان اختلافات کی وجہ سے علمائے ربانی نے عام طور سے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور وہ درباری، سیاسی اور عوامی زندگی سے الگ تھلگ اور خاموش رہنے لگے، اس لیے اسلامی فقہ کی تعبیر اور تشریح ایسے علماء کے ہاتھوں میں رہی جن میں حرارت ایمانی تو تھی، لیکن اجتہادی فکر بہت کم تھی، اس لیے اس حرارت ایمانی کی وجہ سے وہ احتساب میں تو بڑی سختی کرتے تھے، بدعت، شرک اور کفر کے فتادے برابر جاری کرتے رہتے، مگر وہ مشکلات کا حل نکال کر صحیح رہنمائی نہ کرسکے تاہم ان کی یہ دار وگیر رائیگاں نہیں گئی، اس سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ہندوستان میں اسلام کی شکل بہت زیادہ بگڑنے نہیں پائی، اور مسلمان ہندوستان میں باہر سے آنے والی دوسری قوموں، مثلاً یونانی، سیتھین اور پارتھیں کی طرح یہاں کے مقامی باشندوں میں بالکل ضم نہیں ہوگئے، اور ان کی انفرادیت قائم رہی،

مسلمانوں کی تہذیبی زندگی مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ضم نہ ہونے اور انفرادیت قائم رکھنے کے باوجود اپنی معاشرتی اور تمدنی زندگی حتی کہ بعض مذہبی مراسم میں بھی یہاں کے کچھ نہ کچھ مقامی اثرات قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے، ان میں سے بعض برے اثرات کو دور کرنے کے لیے اصلاحی اور تجدیدی کوششیں بھی جاری رہیں،

لیکن ان کوششوں کے باوجود مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی صحیح معنوں میں اسلامی نہ بن سکی اور وہ اپنی اسی ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اسلامی کہنے لگے، جن میں اسلامی رنگ کے ساتھ مقامی اثرات بھی تھے، اس لیے آجکل یہ ایک متنازعٌ فیہ موضوع بن گیا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب جو ہم کو ترکہ میں ملی ہے وہ ہندوستانی تہذیب سے علیحدہ ہے یا دونوں ایک ہیں۔ ایک گروہ دونوں میں بڑی حد تک وحدت پاتا ہے، اور وہ کثرت میں وحدت کا قائل ہے اور دوسرا گروہ اس وحدت کو محض خارجی وحدت قرار دیتا ہے اور اس میں کوئی داخلی وحدت نہیں پاتا، وہ داخلی وحدت ان احساسات و جذبات اور رجحانات کا نام رکھتا ہے، جن سے اس کی دینی، فکری، نظری اور ذہنی برتری اور بہتری ہر حال میں قائم رہتی ہے، خواہ وہ عملی حیثیت سے اس کا نمونہ نہ ہو، اس احساسِ برتری کو برقرار رکھنے میں ہر زمانہ کے علماء نے بڑی کوشش کی، انہی کی بدولت یہ احساس قائم رہا،

احساس برتری | لیکن اس احساسِ برتری کی شدت میں بعض علماء اپنے عہد کے حکمرانوں کو کچھ ایسے مشورے دیدیتے جو سیاسی اور ملکی مصالح کے لحاظ سے بالکل نامناسب ہوتے، مثلاً شیخ الاسلام مولانا سید نورالدین مبارک غزنوی نے شمس الدین التتمش کو اور قاضی مغیث الدین بیانوی نے علاءالدین خلجی کو غیر مسلموں کو اطاعت گذار اور فرماں بردار بنانے کے جو مشورے دیے اُن میں عہد سپہگری کے جذبات کی زیادہ جھلک ہے، اُن کا تجزیہ اگر موجودہ دور کے علماء کریں تو وہ یقیناً ان کو اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف قرار دیں گے، اور خود دیانتدار ہندو مورخین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ اس دور کے مورخین یا علماء غیر مسلموں کے خلاف اپنے جوش و خروش کا اظہار

Marfat.com

محض اس لیے کرتے رہے کہ ان کی اور ان کے حکمرانوں کی شہرت اسلامی ممالک میں مجاہدین اور مبلغین اسلام کی حیثیت سے برقرار رہے، ایسے ہندو مورخین نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ فتح و تسخیر کے زمانے میں تو ہندوؤں کو صعوبتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑتا، وہ یکایک بڑے علاقے سے اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیے جاتے، ان کے مذہب بھی تحقیر سے دیکھا جاتا، لیکن جونہی فتح و کامرانی کا جوش ختم ہوتا تو ان کو رواداری اختیار کرنی پڑتی، اور وہ ہندوؤں کو اپنی سلطنت کا ضروری جزو سمجھنے پر مجبور ہوتے،

اورنگزیب کی رواداری اورنگ زیب کو شریعتِ اسلامی کا بہت بڑا علمبردار سمجھا جاتا ہے، لیکن جب وہ دارا شکوہ کو مغلوب کرنے کے بعد اپنے دوسرے بھائی شجاع کے خلاف کھجوہ میں اترا تو اس کی فوج کے برانغار میں راجہ جسونت سنگھ دس ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ متعین تھا، اس کے علاوہ کم از کم چالیس راجپوت سردار دوسرے بازوؤں پر راجپوت سپاہیوں کے ساتھ لڑ رہے تھے، اور نگزیب اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں راجپوت سرداروں کے ماتحت لشکر بھیجنے میں مطلق تامل نہ کرتا تھا، عہدوں اور ملازمتوں کے دینے میں اورنگزیب اسی اصول کا پابند تھا جکا ہر ہوشمند حکمراں کو ہونا چاہیے، اس کے ایک منصب دار امین خان نے دو پارسی ملازموں کو علیحدہ کرنے کے سلسلہ میں لکھا کہ وہ آتش پرست ہیں، ان کی جگہ کسی مسلمان کو مقرر کیا جائے، کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، اورنگزیب نے جواب میں لکھا کہ اس قسم کے کاروبار میں مذہب کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے، اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے، اور اس کی تائید میں "لکم دینکم ولی دین" کی آیت پیش کی اور لکھا کہ اگر امین خاں کی نقل کردہ آیت کا

Marfat.com

وہ مفہوم ہوتا جو اس نے سمجھا ہے اور اس کو سلطنت کا دستور بنایا جائے تو پھر چاہیے کہ ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعایا کو غارت کر دیا جائے، مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے، شاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے مطابق ملیں گی، اس کے علاوہ اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتی ہیں،

اورنگزیب کو عام طور سے غیر مسلم مورخین متعصب حکمراں کہتے ہیں، مگر ملازموں کے تقرر میں اس کا یہ اصول تھا، اگر مسلمان حکمران اس پر عامل نہ ہوتے تو شاید انکی حکومت اتنے دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، لیکن بعض متشدد علماء کی زبان سے جو فقرے یا جملے نکل گئے تھے، ان کو تو اسلام کی تعلیم سمجھ لیا گیا، اور جو علماء ہندوؤں کے ساتھ خاموشی سے ہمدردی، رواداری، لینت و محبت کا ثبوت دیتے رہے، اس کو بھلا دیا گیا، اور موجودہ دور کے بعض مورخین علماء کے تند اور تلخ فقروں کو اچھال کر اس عہد کی تاریخ کو تاریک بنانے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں اور انکو فرقہ دارانہ اشتعال انگیزی کا ذریعہ بنا لیا ہے، اور مسلمان اہل قلم کی ساری سرگرمیاں اس غلط فہمی کو دور کرنے میں صرف ہو رہی ہیں،

عبادت گاہوں کا انہدام اسی طرح عبادت گاہوں کے انہدام کا مسئلہ ہے، بعض مسلمان فرمانرواؤں نے اپنے احساس برتری، فاتحانہ غرور، سپاہیانہ غیظ و غضب، حربی جوش اور حصول دولت کی طمع میں کچھ مندر ضرور منہدم کیے، جس کی ذمہ داری اس زمانہ میں مذہب اسلام پر رکھی جا رہی ہے، حالانکہ اسلامی قانون کے رو سے پرانے مندر کسی حال میں توڑے نہیں جا سکتے، اس کے باوجود کسی بادشاہ کے ذاتی فعل کو اسلام کا قانون مشہور کرنے میں بعض غیر مسلم مورخین تامل نہیں کرتے،

اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مدافعت اور معذرت میں ہر قسم کا زور صرف کیا جارہا ہے،
اس تنازعہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے علماء نے مسلمان حکمراں اور غیر
مسلم رعایا کی حیثیت کو پورے طور سے واضح کرنے کی کوشش نہیں کی، حالانکہ شروع
میں محمد بن قاسم نے سندھ میں اپنی غیر مسلم رعایا کو وہی حیثیت دی، جو صحابہ کرام نے
اہل فارس کو دی تھی، یعنی ان کو شبہ اہل کتاب تسلیم کیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ دو باتوں
کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور میں ان کے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ
کیا جائے، اور ان کے مندروں کی حیثیت ایران کے آتشکدوں کی طرح رکھی گئی،
اور جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے، اسی طرح مصالحت کے بعد مندر بھی
محفوظ رہنے دیے گئے۔

محمد بن قاسم نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بڑی رواداری اور محبت کا ثبوت دیا،
اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک روایت کے مطابق محمد بن قاسم کے جانے کے بعد وہاں کے لوگ
اس کا بت بنا کر پوجتے تھے، حقیقت یہ ہو کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں ترک اور مغل
زیادہ تر نو مسلم تھے، اسلام نے اُن کو تہذیب اور شائستگی کا لباس ضرور پہنایا تھا، مگر وہ
اپنی قبائلی اور نسلی خصوصیات کو بالکل بھول نہ سکے، اس لیے اپنی معاشرت کو بہت زیادہ
اسلامی رنگ نہیں دے سکے، ان کے ساتھ جو علماء رہے وہ بھی ترکستانی اور ماوراءالنہری
تھے، جن کا مذہبی فکر و تدبر بھی نسلی خصوصیت سے خالی نہ تھا، راعی اور رعایا کے رشتہ کو
کو بھی اسی انداز میں سوچتے تھے، اور انھوں نے کبھی ان کی حیثیت کو واضح کرنے کی
کوشش نہیں کی، وقتی ضرورت اور مصالح کی بنا پر فتاوے دیتے رہے، اگر ترکوں اور
مغلوں کے بجائے عرب حکمراں ہوتے اور ان کے جلو میں حجاز کے علماء رہتے تو وہ دین اسلام

Marfat.com

کے حقیقی حامل اور اس کے مزاج شناس ہونے کی وجہ سے اسلام اور اسلامی زندگی کو کچھ ایسے رنگ میں پیش کرتے کہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی،

جہانتک عبادت گاہوں کے انہدام کا تعلق ہے، اس میں مذہبی جوش سے زیادہ سیاسی غلبہ واقتدار کو دخل تھا، اسی لیے مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندو راجاؤں کے ہاتھوں مسجدوں کے انہدام کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں، چنانچہ دجیانگر کے راجہ نے احمد نگر پر غلبہ پایا تو وہاں کی مسجدوں کو منہدم کیا اور ان کے احاطہ میں رقص وسرود کی مجلس قائم کی، حضرت مجدد نے اپنے مکتوبات میں جہانگیر سے اصرار کیا ہے کہ وہ اپنے دور کی منہدم مسجدوں کو پھر سے تعمیر کرائے، شاہجہانی عہد میں بہت سی مسجدیں مسمار کردی گئی تھیں اور ان کے بجائے مندر بنا دیے گیے تھے، شاہجہاں کو خبر ہوئی تو اس نے کوئی عام سزا نہیں دی، بلکہ جن مسجدوں کو گرا کر مندر بنا دیے گئے تھے، وہ پھر مسجدیں بنا دی گئیں، مرہٹے ستارہ اور ویرلی کے قلعوں میں داخل ہوئے تو بیجاپور کے حکمرانوں کی تعمیر کردہ مسجدوں کو مسمار کر دیا۔ اس لیے اگر مسلمان حکمرانوں اور فاتحوں نے اپنی طاقت اور قوت کے غرور میں مندروں کو منہدم کیا تو یہ انکا ذاتی فعل تھا، جس کے لیے کوئی معذرت پیش کرنے اور شرم سے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں جس کے تمام فرمانروا مذہبی واخلاقی معیار پر ہر زمانہ میں پورے اتر سکیں، اور ہر اعتراض سے پاک ہوں، اچھوں اور بروں سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں، البتہ اس سلسلہ میں مذہب کو بحث میں لانا صریحاً بددیانتی اور بدطینتی ہے،

مسلمان حکمرانوں کا مذہبی تعصب یہ ہندوستان کی تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن مسلمان حکمرانوں پر مذہبی تعصب، ہندو کشی اور مندروں کے انہدام کا الزام لگایا جاتا ہے،

Marfat.com

وہ زیادہ تر ہندو ماؤں کے بطن سے تھے، عام طور سے مورخین انہدامِ مندر کے سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگزیب کا ذکر کرتے ہیں، اول الذکر چاروں حکمرانوں کی مائیں ہندو تھیں، اور اورنگزیب کی ماں تو نہیں لیکن دادی راجپوت شہزادی تھی، اور اسی لیے بعض ہندو اہلِ نظر کی رائے یہ ہے کہ ان مخلوط شادیوں سے جو نسلیں پیدا ہوئیں وہ ہندوؤں کے لیے خالص خون والے مسلمانوں سے زیادہ مخالف اور متعصب ثابت ہوئیں، اور پھر اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اورنگزیب کے مذہبی تعصب کی بنا پر سیواجی پیدا ہوا تو اکبر جیسے روادار حکمراں کے عہد میں رانا پرتاب کا وجود سمجھ میں نہیں آتا، یہ دونوں ہندوؤں کے قومی ہیرو بن گئے ہیں، جن کو بڑے سے بڑا وطن پرست مسلمان بھی اپنا قومی ہیرو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اسی لیے ایک خاص مکتبِ خیال کے لوگوں کو کہنے کا موقع ملجاتا ہے کہ متحدہ قومیت کی اساس خارجی وحدت پر نہیں بلکہ داخلی وحدت پر ہی۔

جزیہ | اسی طرح جزیہ کو ایک توہین آمیز ٹیکس سمجھا جاتا ہے، اور یہ محض اس لیے کہ سلاطین اور علما دونوں نے اس کے روشن پہلو کی وضاحت پوری طرح نہیں کی، جزیہ دراصل اُس ٹیکس کو کہتے ہیں، جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے اس خدمت کے معاوضہ میں وصول کرتی ہے کہ وہ ان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، اس ٹیکس کے لینے کے بعد حکومت ہر طرح سے ذمیوں کے جان و مال کی نگرانی کرتی تھی، اور ایسا کرنا اُس کے مذہبی فریضہ میں داخل تھا، اور جو حکومت ان کی حفاظت کرنے سے قاصر رہتی اس کو جزیہ وصول کرنے کا حق نہ ہوتا، اس کے علاوہ کسی عالم یا فقیہ نے جزیہ کا کچھ اور مطلب بتایا تو یہ اس کا قصور ہے، ٹیکس کا نقص نہیں، علما کے اصرار کے باوجود مسلمانوں کے پورے دورِ حکومت میں صرف تین حکمرانوں علاء الدین خلجی،

Marfat.com

فیروز تغلق اور اورنگزیب کے عہد میں یہ ٹیکس لگایا گیا، اور اس زمانہ میں یہ ٹیکس اتنا اشتعال انگیز نہیں سمجھا گیا جتنا اب طرح طرح کی موشگافیوں سے سمجھا جانے لگا ہے، اس زمانہ کے تمام راجہ اسکو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کر دیا کرتے تھے، اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے، حالانکہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا، مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی، اور ایسے مورخ کی کوئی وقعت نہیں ہو گی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی لیکن ملک داری میں انکی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی، وہ میدانِ جنگ میں خواہ کیسی ہی خونریزی کرتے لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کر لیتے، کیونکہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی، اونچے عہدہ دار تو مسلمان ضرور تھے لیکن دوسرے تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے، کیونکہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اور اگر ان کے ساتھ رواداری نہ سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی،

تبلیغ اسلام | اس حقیقت کے باوجود انہدام مندر اور جزیہ کے مسئلہ کو اچھال کر مسلمان حکمرانوں کے مذہبی تعصب اور تشدد میں طرح طرح کی رنگ آمیزی کی گئی ہے، اور یہ الزام عام طور سے رکھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علما ان تمام حکمرانوں سے اس لیے بدظن نظر آتے ہیں کہ ان کے

کہنے کے مطابق انھوں نے "اما القتل واما الاسلام" پر عمل نہیں کیا، اور پورے ہندوستان کو اسلام کے نور سے منور ہونے نہیں دیا، لیکن تاریخ کو مڑکر دیکھنے کے بعد خود علماء پر یہ الزام آتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں انھوں نے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں وہ اسپرٹ اور تنظیم نہیں دکھائی جو انگریزوں کے زمانہ میں عیسائی مبلغین دکھاتے رہے، ورنہ ہندوستان کی تصویر آج کچھ اور ہوتی،

اسلام کی اثر پذیری

لیکن سلاطین اور علماء کی اس غفلت کے باوجود یہاں کے باشندے اسلام کی ہمہ گیری خصوصاً اس کے خالص توحید کے تخیل، عقلیاتی تصور زندگی، معاشرتی اخوت، مساوات اور اجتماعی یگانگت کو دیکھ کر خود اس کی طرف مائل ہوئے، وہ اپنے یہاں کی ذات پات کی طبقاتی تقسیم اور اس کی بندشوں سے کچھ ایسے نالاں تھے کہ تھوڑی سی کوشش سے حلقہ بگوش اسلام ہونے میں تامل نہ کرتے، اس لیے اسلام خودبخود ہندو مت کے لیے ایک چیلنج بن گیا، اور ہندو اپنی مذہبی اصلاح کے لیے مجبور ہوگئے۔ اور ان میں مختلف قسم کی مذہبی و اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں، ان کی کم وبیش یہی غایت تھی کہ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کے عوام کا بھی درجہ بلند ہو، ممکن ہے کہ بھکتی کا عقیدہ اسلام سے پہلے کا ہو، لیکن اس میں اسلام کے تصادم ہی سے جان پڑی، شمالی ہند میں جے دیو، میرابائی، رامانند، مہاراشٹرا اور گجرات میں گیانیشور، بنگال میں، چیتن اور کرناٹک میں لنگایت کی ساری مذہبی سرگرمیاں اسلام ہی کے تصور توحید اور تصور حیات سے ماخوذ ہیں، ان کا پیام تھا کہ سارے انسان خدا کی نظروں میں یکساں ہیں، اس لیے بلاامتیاز ہر قوم اور ہر طبقہ کے لوگوں کو ان تحریکوں میں شریک ہونے کی عام دعوت تھی، اس میں کچھ مسلمان بھی

شریک ہوئے، رامانند کے مشہور چیلے کبیر تھے، کبیر کے معتقد تقی سہروردی کی لڑکی کمال کی شادی ایک برہمن سے ہوئی، کبیر کی چیلی گنگا بائی تھیں، داؤد کے چیلے شیخ بہارجی، باقرجی اور رجب جی تھے، چتین کے مشہور چیلوں میں روپ، سناتن اور ہری داس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے،

ان تحریکوں سے مسلمانوں میں ہندی شاعری بھی مقبول ہوئی تو قطبن نے مرگاوتی، منجھن نے مادھومالتی، ملک محمد جائسی نے پدماوت، عثمان نے چترا ولی، شیخ نبی نے گیان دیپ قاسم شاہ نے ہنس جواہر، نور محمد نے اندراوتی، فاضل شاہ نے پریم رتنا لکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، کچھ ایسے بھی ہندی مسلمان شعراء گذرے ہیں جنھوں نے کرشن بھگتی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، مثلاً کرشن بھگتی پر، رسخان کی نظمیں مذہبی جوش اور محبت کے غلو میں سورداس سے کم نہیں سمجھی جاتی ہیں، اس کے علاوہ قادر، جمال، مبارک، طاہر اور تاج نے بھی کرشن سے عقیدت ظاہر کی،

وحدت ثقافی کی سعی ناکام | مذکورہ بالا ہندو پیشواؤں اور مسلمان شاعروں نے ہندو دھرم اور اسلام کے باطنی شعور کو باہم سمو کر دونوں میں وحدت اور مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ تحریکیں مذہبی تاریخ اور عمرانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے تو بڑی دل آویز ہیں، لیکن جب یہ مذہب کے اصول وعقائد اور رسوم وعبادات سے ٹکرائیں، تو زیادہ موثر ہو کر پھیل نہ سکیں، راسخ العقیدہ ہندو اور مسلمان دونوں ان کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوئے، بلکہ علماء تو کچھ مسلمانوں کو ان تحریکوں میں شریک ہوتے دیکھ کر ان کے مخالف ہو گئے اور ان کے خلاف ارتداد کا فتویٰ دیدیا،

Marfat.com

ہندوستان کی تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں سے باطنی اور روحانی اتحاد کے بجائے ذہنی اور مذہبی انتشار پیدا ہوجاتا ہے، اکبر کا دین الٰہی اس کی ایک واضح مثال ہے، اس سلسلہ میں راجہ مان سنگھ کا ردیہ قابلِ ذکر ہے، اکبر نے جب اس کو اس مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دی تو اس دلیر راجپوت سپاہی نے جواب دیا کہ اگر مریدی سے مراد جان نثاری ہے تو اس کو آپ آزما چکے ہیں کہ آپ کے لیے ہمیشہ جان ہتھیلی پر رکھی ہے، اس کے بعد مزید آزمایش کی ضرورت نہیں اور اگر مذہبی مریدی مراد ہے تو میں ہندو ہوں، فرمائیے مسلمان ہوجاؤں، ان کے علاوہ اور کوئی راستہ تو جانتا نہیں، مان سنگھ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص مذہب میں سچا ہوگا، وہی وفاداری اور اخلاص میں پورا اترے گا، کیونکہ ہر مذہب کی بنیاد وفا اور اخلاص پر ہے، اگر اہل مذہب میں اخلاص نہ ہو تو یہ مذہب کا تصور نہیں، بلکہ بدمذہبی کا تصور ہے، راجہ مان سنگھ اپنی عملی زندگی میں اس کا ثبوت دیتا رہا، جب اس کی رہنمائی میں کہیں فوج جاتی تو ہر پڑاؤ پر مسلمان لشکریوں کے لیے اپنی نگرانی میں نماز ادا کرنے کے لیے خیمے تیار کراتا اور پہلے ان کی راحت کا سامان کر لیتا، اسکے بعد اپنی فکر کرتا،

دلوں کی تسخیر اور یہ بھی تاریخ ہند کا ایک عجیب پہلو ہے کہ اکبر نے تو اپنی رواداری اور ہندو نوازی سے مسلمانوں کو اپنے سے ناخوش کر دیا، لیکن پھر بھی رانا پرتاب جیسا حریف پیدا ہی ہوگیا، جہانگیر اور شاہجہاں دونوں مسلمان رہ کر ہندو نواز رہے، وہ راجپوت ماؤں کے بطن سے ہونے کے باوجود اسلامی غیرت اور حمیت کے پاسبان تھے، اور دونوں کی خاطر راجپوت اپنے خون سے ہولی کھیلتے رہے، شاہجہاں نے تو کسی راجپوت

Marfat.com

خاندان میں شادی بھی نہیں کی، لیکن راجپوت سردار اس کی خاطر ہر چھوٹی بڑی لڑائی میں بڑے فخر و غرور کے ساتھ شریک ہوتے اور خود شاہ جہاں کو ان پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ اس نے راجپوت سرداروں کو اپنے ہم مذہبوں کے خلاف بلخ اور بدخشاں کی مہم میں بھیجا، جہاں انھوں نے اپنی جانبازی کا پورا ثبوت دیا، مغل بادشاہوں کے پورے دورِ حکومت میں بہت سے راجپوت سرداروں نے جس وفاداری اور سرفروشی کے ساتھ حربی اور انتظامی خدمات انجام دی ہیں وہ اس دور کی تاریخ کا بہت ہی روشن کارنامہ ہے، اسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ دلوں کی تسخیر کے لیے رواداری، خاطر داری، مفاہمت، مصالحت، محبت اور یگانگت کی ضرورت ہوتی ہے، مذہبی عقائد اور روحانی ارادت کی خواہ مخواہ وحدت ضروری نہیں جس کے نہ صرف علمار بلکہ پنڈت بھی مخالف رہے،

علمار کی تصنیفی رواداری آج کل کی تاریخوں میں عام طور سے ان ہی علما، کا ذکر کیا جاتا ہے، جو اپنے مسلک میں شدت اور سختی کا اظہار کرتے تھے، اور ان روادار اور وسیع القلب علمار کو عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو ہندوؤں کے مذہب اور علوم و فنون سے پوری دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں کو ان کے مطالعہ کے لیے تیار کرتے رہے،

محمود غزنوی کی تلوار سے ہندوؤں کے دلوں میں جو کدورت پیدا ہوئی وہ شاید ابتک نہیں گئی ہے، لیکن محمود غزنوی کے لشکر کے جلو میں البیرونی بھی تھا، جس نے اپنی رواداری، بے تعصبی، وسیع المشربی اور فراخ دلی سے کام لیکر ہندوؤں کے علوم و فنون کی وہ خدمت کی ہے جس کے احسان سے ہندوکیا، پورا ہندوستان

کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے علوم و فنون پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، اس کو اپنی کتاب الہند کے ذریعہ سے بالکل اٹھا دیا، ہندوؤں کے مذہبی، عقلی اور حسی عقائد و خیالات اور ان کی مقدس کتابوں مثلاً بید، پران، ان کی پرستش گاہوں، ان کے تہواروں، ان کے نجوم، ریاضی، ہیئت، عروض، تناسخ، قانونِ وراثت وغیرہ پر اس نے نہایت مستند معلومات جمع کر کے غالباً پہلی دفعہ غیر ہندوؤں تک پہنچا دیا، ان کو پڑھتے وقت مطلق محسوس نہیں ہوتا کہ اس کا لکھنے والا کوئی غیر مذہب کا ہے، اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا بھی کام انجام دیا ہے، عربوں اور ایرانیوں کو ہندوؤں کے علوم اور ہندوؤں کو عربوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے آگاہ کیا، اس نے عربی جاننے والوں کے لیے سنسکرت اور سنسکرت جاننے والوں کے لیے عربی سے کتابیں ترجمہ کیں، ان کتابوں اور ترجموں کی بڑی لمبی فہرست ہے، جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں،

اسی طرح ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں ہندوؤں کے مذہبی علوم مثلاً میمانسا، بیدانت، سانکھ، اٹھارہ بدیا، کرم بپاک، آگم، سکن، سامدرک، گارد، اندرجال، رس بدیا، رتن پریچھا وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اس کو علیحدہ شائع کیا جائے تو خود ہندوؤں کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی،

البیرونی اور ابو الفضل کا شمار دینی علما میں نہیں ہوتا ہے، اس لیے ممکن ہو کہ ان کے تصنیفی کارنامے علما کے دائرہ سے خارج سمجھے جائیں، لیکن عہد اکبری میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ کرنے والوں میں ملا عبد القادر بدایونی، ملا شیری، اور حاجی سلطان تھانیسری جیسے علما بھی تھے، ملا عبد القادر بدایونی جیسے متشدد ملا نے

Marfat.com

راماین اور اتھرین وید کے ترجمے کیے، اتھرین وید کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کے بعض احکام اسلام سے ملتے ہیں، مثلاً ایک حکم یہ ہے کہ جب تک ایک فقرہ نہ پڑھے جس میں برابر بہت سے لام آتے ہیں، جیسے لا الٰہ الا اللہ تب تک نجات نہیں ہو سکتی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے چچا شیخ رزق اللہ سنسکرت کے بڑے عالم تھے، اور ہندوؤں کے علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے، شاہجہانی عہد میں مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے مہادیو اور پاروتی کی گفتگو کو قلمبند کر کے ہندوؤں کے نظریہ تخلیق کو سمجھایا ہے، پھر مرآۃ المخلوقات میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوؤں کی بعض مذہبی ہستیاں مسلمانوں کے تخیل کے مطابق ہیں، مثلاً مہادیو کو شاہ جن کہا جا سکتا ہے، اسی طرح بعض دوسری شخصیتوں کو حضرت آدمؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابقت دی ہے، انھوں نے بھگوت گیتا کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کیا، یوگ ویسشٹ کا ترجمہ شیخ صوفی قنبہانی نے کشف الکنوز کے نام سے کیا، شمس بازغہ کے مشہور مصنف ملا محمود جونپوری نے ہندوستان کے خاص فن نائیکا بھید کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر ایک کتاب لکھی، مولانا نجم الدین حسن کے رسالہ شطاریہ میں ہندوؤں کے مراقبے کے طریقے لکھے ہیں، ریاحین البساتین میں نروان پر بحث ہے، محسن فانی کا شمار علماء میں نہیں ہے، لیکن اس کی دبستان المذاہب میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں سے متعلق بہت سے مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، مرزا مظہر جانجاناں تو وید کو الہامی کتاب مانتے تھے، اور ہندوؤں کو اہلِ کتاب میں شمار کرتے تھے، عرب اور ہندوؤں کی بت پرستی میں یہ فرق بتایا ہے کہ عرب کے بت پرست اپنے بتوں کو ذاتِ الٰہی کی طرح متصرف اور موثر حقیقی سمجھتے تھے، اور ہندو بتوں کے تصرف کو ان کا تصرف نہیں بلکہ تصرفِ الٰہی سمجھتے تھے، سبحۃ المرجان میں آزاد بلگرامی حضرت آدمؑ

کے ہندوستان میں ورود کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب آدم سب سے پہلے ہندوستان میں اترے تو یہاں پر وحی آئی، اس لیے سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی، اور چونکہ نور محمدی حضرت آدمؑ کی پیشانی میں امانت تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین میں ہوا، اسی لیے آپ نے فرمایا کہ مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے، مولانا آزاد بلگرامی نے بلگرام کے ایک عالم شیخ عنایت اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو ہندی سنسکرت، بھاکا اور ہندی موسیقی میں بڑی مہارت تھی، مگر علماء کی یہ تصنیفی رواداری آج بالکل بھلا دی گئی ہے،

مسلمانوں کی عام رواداری

عام مسلمانوں نے اپنی معاشرتی زندگی میں بھی رواداری کا ثبوت دیا، اور انھوں نے علماء کے احتجاج کے باوجود بعض مذہبی رسوم تک میں ہندوستان کے مقامی اثرات قبول کیے، مثلاً شب برات جس طرح ہندوستان میں منائی جاتی ہے، کسی اور اسلامی ملک میں نہیں منائی جاتی ہے، فیروز شاہ تغلق جیسا مذہبی بادشاہ چار روز تک آتش بازی چھوڑنے کا اہتمام کرتا تھا، ڈھول اور باجے بجائے جاتے جس سے لطف لینے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شب برات کی موجودہ رسمیں ہندوؤں کی شیوراتری کی نقل ہیں، ہندوستان میں جس طرح محرم منایا جاتا ہے کسی اور اسلامی ملک میں نہیں منایا جاتا ہے، محرم کی دھوم دھام میں دسہرہ کے اثرات پائے جاتے ہیں، اسی طرح موسیقی، مصوری، تعمیرات، لباس، عورتوں کے زیورات، کھانے پینے، شادی بیاہ کے رسوم، گیت راگ، نیجا، سیوم، گیارھویں شریف، احمد کبیر کی گائے، بیواؤں کے

عقد ثانی سے گریز اور دوسری معاشرتی چیزوں میں مسلمان ہندوؤں سے متاثر ہوئے، اسی لیے ایک مکتبۂ فکر کا خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ہندوؤں سے زیادہ اور ہندو مسلمانوں سے کم متاثر ہوئے، لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے جو بھی چیزیں لیں اُن میں کچھ ایسا نکھار اور بانکپن پیدا کر دیا کہ ان کی اصلی شکل چھوڑ کر ان کو اختیار کر لیا، اور وہ خالص مسلمانوں کی چیزیں کہلانے لگیں،

نومسلموں میں تو پشت ہا پشت گذر جانے کے بعد بھی اُن کی نسلی، خاندانی اور مقامی روایات کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہے، جہانگیر کو بعض نومسلموں کی اس قسم کی بعض باتوں کو دیکھکر سخت تعجب ہوا تھا، اس نے تزک میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ کشمیر جا رہا تھا، تو دریائے جھیلم کے کنارے قیام پذیر ہوا، اسکو معلوم ہوا کہ یہاں کے مسلمان اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ چتا پر جلاتے ہیں، جہانگیر نے اس کی ممانعت کرا دی، اس کو یہیں یہ بھی اطلاع ملی کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کی شادی ہندوؤں کے ساتھ کر دیتے ہیں، اس زمانے میں کچھ نومسلم اہل قلم ایسے بھی تھے کہ جب ہندی میں کوئی تحریر لکھتے تو اس کے دستور کے مطابق اس کا آغاز کسی دیوتا کے نام سے کرتے، مثلاً جہانگیر ہی کے عہد میں ایک مصنف احمد نے اپنی کتاب سامدریکا ہندی میں لکھی تو اس کی ابتدا گنیش نامہ سو لکھکر کی اسی طرح احمد اللہ دو کشانی اپنی تصنیف نیا کا بھید میں سری رام رام جی سہائے، سرستی اور گنیش کے نام لیے ہیں، یعقوب نے رسا بھوشن لکھی تو اس میں سری گنیش، ہری سرستی جی، سری رادھا کرشن اور سری گوری شنکر جی کے فضل و رحمت کا طالب ہوا ہے، غلام نبی رسلین نے اپنی دو کتابوں انگا درپنا

اور راسا پر بودھ کا آغاز سری گنیش نامہ لکھ کر کیا ہے، اعظم خاں نے محمد شاہ کے حکم سے سنگار درپن لکھی تو رامانوجا کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا، اور ہندی کے جن مسلمان شعرا نے کرشن جی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا، اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کی مذہبی حیثیت سے بحث نہیں، بلکہ صرف ہندوؤں کے اثرات دکھانا مقصود ہے،

یہ روادارانہ میل جول آج کل ہندستان میں قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کے حامیوں کے لیے بہت ہی دلچسپ موضوع بنا ہوا ہے، اور وہ ان مثالوں کو پیش کر کے ایک نیا قومی ذہن اور شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن یہ تمام چیزیں ہر زمانہ میں علماء کو کھٹکتی رہیں، ایسے علماء کے جذبات کی ترجمانی ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں کی ہے، اکبر رواداارانہ میل جول کا سب سے بڑا علمبردار سمجھا جاتا ہے، ملا مبارک ناگوری کی ساری مجتہدانہ قوتیں بھی اس کی حمایت میں صرف ہوئیں، ابوالفضل نے اپنی انشا پردازی کا سارا کمال بھی اکبر کو اکبر اعظم بنانے میں دکھایا، لیکن ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کے خلاف اپنی تحریروں سے ایک فضا پیدا کر دی ہے، اور اس سے اکبر پر بہتر سے بہتر کتابیں لکھنے کے باوجود مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقہ کے دلوں میں اس کے خلاف جو آزردگی بلکہ اسلام دشمنی کی کدورت پیدا ہو گئی تھی، وہ آج تک دور نہیں ہوئی ہے، اور یہ طبقہ اب کچھ اکبر سے اس لیے مطمئن نظر آتا ہے کہ نئی تحقیقات سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے مذہبی خیالات سے تائب ہو کر آخر وقت میں ایک سچا کلمہ گو مسلمان ہو گیا تھا، اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوا، لیکن

Marfat.com

پھر بھی وہ اکبر کو عالمگیر پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ غیر مسلم مورخوں نے عالمگیر کی مخالفت میں تاریخی لٹریچر کا ایک بڑا ڈھیر لگا دیا گیا ہے،

علمار اسلام کی تعلیم و تعلم، اس کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار اور مذہبی عقائد کے نگراں و محافظ تھے، اس لیے برابر ڈرتے رہتے کہ مسلمان اپنی رواداری اور بیرونی اثرات کو قبول کرنے میں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے دور نہ ہو جائیں، راسخ العقیدہ مسلمان یہ کہتے کہ اگر کوئی مسلمان حکمراں اپنی غفلت سے اپنی فوج کی سپہگری اور جانبازی کے اوصاف کو برقرار نہیں رکھتا ہے اور بیرونی حملہ کے وقت اس کی فوج سپرانداز ہو جاتی ہے تو سارا الزام حکمراں کی نالائقی پر آتا ہے، اسی طرح اگر مسلمانوں میں بیرونی اثرات سے بے دینی، گمراہی اور بے راہ روی پیدا ہوئی تو اس کا الزام علمار کے سر آتا ہے جنھوں نے دینی کے وارث بن کر نبی کی تعلیمات کو بیرونی آلائیشوں اور آمیزشوں سے پاک رکھنے میں ہمت و عزیمت کا ثبوت نہیں دیا، لیکن اس دور میں جب کہ اجتماعی یکجہتی کا آغاز نہیں ہوا تھا، ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کی اصلاحی اور مذہبی تنظیم علمار کے بس کی بھی بات نہ تھی، البتہ ان کی یہ کوشش ضرور رہی کہ مسلمانوں کے بنیادی عقائد اور داخلی تصورات ہر طرح محفوظ رہیں، اور ان کی یہ کوشش رائگاں نہیں ہوئی، پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ کوشش درس و تدریس اور وعظ و تلقین کے ذریعہ سے برابر جاری رہی، اور ان کی علمی اور تصنیفی سرگرمیاں اس میں زیادہ معاون ہوئیں۔

علمار کے تصنیفی کارنامے ان پر آج یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں دلنشیں اور مفید لٹریچر پیش کر کے عوام کو خود سر

اسلام سمجھنے کا موقع نہیں دیا، حالانکہ مسلمان حکمرانوں نے علم نوازی اور معارف پروری میں کوئی کمی نہیں کی، وہ ہر دور میں اہل علم کی پوری سرپرستی کرتے رہے شمس الدین التمش رات کو گدڑی اوڑھ کر شہر میں گشت کرتا، اگر کسی کو کوئی تکلیف ہوتی تو اس کو رفع کرتا، چپکے سے علما، اور صلحار کے گھروں میں روپے کی تھیلیاں پھینک دیتا، بلبن علمار کے بغیر کھانا نہ کھاتا، اور اس کا دسترخوان مذہبی مذاکرے کی مجلس میں منتقل ہوجاتا، شاہانہ جلال وحشمت کے باوجود ان کے گھروں پر بے تکلف چلا جاتا، ان میں سے کسی کا انتقال ہوجاتا تو تعزیت کے لیے ان کے گھر پر جاتا، ان کے جنازے میں شریک ہوتا، اور ان کے عزیزوں کو وظیفے اور جاگیریں عطا کرتا، محمد تغلق کو ایک مہم میں کامیابی ہوئی تو اس مہم میں علمار اس کے ساتھ تھے، اس لیے اس نے اس کامیابی کو ان ہی کی برکت سمجھا، اور حکم دیا کہ علمار خزانہ میں داخل ہوکر جس قدر دولت لے جاسکیں لے جائیں، اس نے شیخ ابوبکر خلال کو چند علمار کے ساتھ سمرقند بھیجا، کہ وہاں کے مشہور عالم برہان الدین ساغرجی کو ہندوستان لے آئیں، اور ان کے سفرخرچ کے لیے چالیس ہزار تنکے بھیجے، اسی طرح شیراز کے مشہور قاضی مولانا مجدالدین کے لیے دس ہزار تنکے بھجوائے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ مولانا عبدالعزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن ایک حدیث سنائی، جو اس کو بہت پسند آئی، اس نے جوش مسرت میں مولانا عبدالعزیز اردبیلی کے قدم چوم لیے اور حکم دیا کہ سونے کی سینی میں دو ہزار تنکے لائے جائیں اور خود مولانا پر ان تنکوں کو نچھاور کیا، اور کل تنکے مع سینی کے ان کو نذر کر دیے، اس کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان علوم وفنون کا

Marfat.com

بڑا مرکز بن جائے،

سلطان ابراہیم شرقی کے دربار کے نامور عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی ایک بار علیل ہوئے تو سلطان ان کی عیادت کے لیے گیا، اور ایک پیالہ پانی ان کے سر سے تصدق کرکے پی گیا، اور کہا اے خدا! جو بلا قاضی صاحب پر ہے، وہ مجھ پہ نازل فرما اور ان کو صحت عطا کر۔

شاہانِ مغلیہ کے عہد میں شاعروں اور مصنفوں کا منہ جواہرات سے بھر دینا، ان کے ہموزن روپیے انعام میں دینا، ان کے وظائف مقرر کرنا، نسلاً بعد نسلٍ جاگیریں عطا کرنا ایک عام روایت بن گئی تھی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جب جب شاہجہانی دربار میں باریابی حاصل کرتے تھے، صلۂ گراں پاتے تھے، دو مرتبہ روپیے میں تولے گئے اور وزن میں جس قدر روپیہ چڑھا اُن کو مل گیا، ملا میرزاہد کے والد قاضی محمد اسلم ہروی شاہجہاں کے امام خاص تھے، ان کو بھی شاہجہاں نے روپیے میں تلوایا جو تعداد میں ساڑھے چھ ہزار تھے، ایک بار وہی گھوڑے سے گر گئے، چار مہینے صاحبِ فراش رہے، شفا پائی تو شاہجہاں نے ان کو دس ہزار روپیے نذر کیے اعلمار میں شاید ہی کوئی اہل قلم بیکار رہا ہو،

اسی فیاضانہ زرپاشی اور شاہانہ سرپرستی کی وجہ سے اچھے حکمرانوں کے دور میں علما کی تعداد بکثرت رہی، علاء الدین خلجی کے عہد میں علمار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے دور دراز کے علمار دہلی آتے اور یہاں بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے اور جس علمی تصنیف پر یہاں کے علمار مہر توثیق ثبت کر دیتے وہ علمی دنیا میں معتبر سمجھی جاتی، شاہانِ مغلیہ کے دور میں

بھکر، لاہور، ہانسی، دہلی، تھانیسر، بدایوں، کڑہ، جون پور، الہ آباد، خیرآباد، فرنگی محل، اور بہار علمار کے بڑے مرکز تھے، ان بادشاہوں اور ان کے امرار کی فیاضی اور قدردانی سے قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک علمار اور مدرسین پھیلے تھے، ان کو جاگیریں اور معافیاں ملتی تھیں، اور وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں لگے رہتے تھے، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ، مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی علمی خدمات کو چھوڑ کر ہندوستان کے علمار کے تصنیفی کارناموں کو فکری حیثیت سے بہت زیادہ بلند اور انقلاب آفریں نہیں کہا جاسکتا ہے

علمار کے غور وفکر کا محور قرآن مجید ہی رہا، لیکن وہ زیادہ تر بیرونی علمار کی تفسیروں کشاف، مدارک، اور بیضاوی وغیرہ کی خوشہ چینی کرتے رہے، اور ان کے ہم پایہ تفسیریں نہ لکھ سکے، اور جو لکھیں وہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے خواص تک محدود رہیں، ساڑھے چھ سو (۶۵۰) برس کی مدت میں ان میں سے صرف دو تفسیریں لایقِ استفادہ سمجھی جاتی ہیں، ایک مولانا علار الدین بن احمد مہائمی (المتوفی ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء) کی تفسیر رحمانی، دوسری ملاجیون (المتوفی ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۷ء) کی تفسیر احمدی ہے، اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی زبان فارسی رہی، مگر اس زبان میں کلام پاک کا ترجمہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ایک عرصہ دراز تک نہ ہوا اور جب شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ .... لوگوں میں عام ہونے لگا تو کم ... سواد علمار نے اس کے خلاف شورش برپا کی، گویا اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کا حق صرف اپنے ہی تک محدود رکھنا چاہتے تھے،

علم حدیث میں سب سے زیادہ مشہور کتاب امام حسن بن محمد صغانی کی مشارق الانوار ہے

Marfat.com

قطب الدین ایبک نے اُن کو لاہور کا قاضی بنایا تھا، لیکن آخر میں وہ بغداد چلے گئے تھے، اور وہیں بیٹھکر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کی خواہش پر مشارق الانوار لکھی، گو انکا شمار ہندوستانی علمار میں نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ان کا فیض زیادہ تر باہر رہا، لیکن ان کی مشارق الانوار ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی، علماے محدثین نے اسکی بڑی قدر کی، مدارس کے نصاب میں داخل ہوئی، اور عالم اسلام کے ممتاز علمار نے اس کی ڈھائی ہزار سے زیادہ شرحیں اور حواشی لکھے، سولھویں صدی عیسوی میں مولانا علار الدین علی نے کنز العمال لکھکر حدیث میں ایک بیش بہا اضافہ کیا، اگر ان کتابوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو ہندوستان میں حدیث کی صحیح خدمت یہاں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے ساڑھے تین سو برس بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی، انھوں نے حدیث پر ایک درجن کتابیں لکھیں، جن میں مشہور مشکوٰۃ کی عربی شرح لمعات التنقیح اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات ہیں، مولانا مجدالدین فیروز آبادی کی سفر السعادۃ کی فارسی شرح بھی ان ہی نے لکھی جو حافظ ابن قیم کی زاد المعاد کے برابر سمجھی جاتی ہے ان ہی کی وجہ سے دہلی علم حدیث کا بھی دار السلطنت بن گیا تھا، ان کی علمی کوششوں کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف سے ہوئی، انھوں نے امام مالک کی کتاب موطا کی فارسی اور عربی میں دو مجتہدانہ شرحیں لکھیں، اور صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی، اور بعض دوسرے رسالے لکھ کر حدیث کی دولت کو زیادہ سے زیادہ عام کیا، ان کی مشہور و معروف کتاب ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء نہ صرف ایک عالمانہ بلکہ ایک محدثانہ تصنیف بھی سمجھی جاتی ہے، جس میں بکثرت حدیثوں سے خلفائے راشدین کے مناقب بیان کیے گئے ہیں، جن سے

Marfat.com

عام لوگ واقف نہ تھے، ان دونوں بزرگوں نے علم حدیث کی خدمت کرکے دوسرے علمار کی غفلت کا کفارہ ادا کردیا،

ہندوستان کے علمار کا سب سے محبوب موضوع فقہ رہا ہے، اور جو علمار باہر سے یہاں آئے وہ مفسر اور محدث ہونے کے بجائے زیادہ تر فقیہ رہے، ان کو سلاطین اور امرار کا تقرب آسانی سے حاصل ہوجاتا تھا، کیونکہ وہ مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر فقہار کے ذریعہ سمجھا گیا، جو عموماً اپنی سختی اور درشتی کے لیے مشہور ہیں، اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں اسلام مفسرین اور محدثین کے ذریعہ سمجھا جاتا تو زیادہ موثر ہوتا، فقہ کی اس مقبولیت کے باوجود اہل قلم فقہار زیادہ تر فقہ کی بیرونی کتابوں کے حواشی لکھتے رہے، فتاواے تاتارخانی اور فتاوائے عالمگیری ہندوستان کے بڑے اہم فقہی کارنامے ہیں، ان دونوں کی تدوین ایک امیر اور ایک بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہوئی، البتہ شاہ ولی اللہ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کا رواج دیا اور اجتہاد و تقلید کی وضاحت کرکے کتاب و سنت کے اتباع کی دعوت دی،

فلسفہ میں صرف ملا محمود جونپوری کی الحکمۃ البالغہ قابل ذکر ہے جس کی شرح خود انھوں نے شمس بازغہ کے نام سے لکھی، اگر اس کتاب سے قطع نظر کرلیا جائے تو فلسفہ میں علمار کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ وہ بیرونی ممالک کی مشہور فلسفیانہ کتابوں کی شرحیں لکھتے رہے، سلطان التتمش کے عہد میں مولانا سید نورالدین مبارک نے تو سلاطین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ فلسفہ کی تعلیم کو ملک میں کسی طرح

Marfat.com

روا نہ رکھیں اور معقولات و فلسفہ کے معتقدوں کو اپنے حدودِ سلطنت میں جگہ نہ دیں،

علم کلام سے علماء کو دلچسپی مغل بادشاہوں کے دور میں شروع ہوئی لیکن اس میں بھی وہ زیادہ تر شرحیں لکھنے میں مصروف رہے، البتہ شاہ جہانی عہد میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی الدر الثمین بہت ہی اہم تصنیف ہے، اور عالمگیری عہد میں شیخ عبدالوہاب المخاطب بہ منعم خان قنوجی کی بحر المذاہب بھی مفید کتاب ہے، آخر میں شاہ ولی اللہ نے العقیدۃ الحسنہ اور حجۃ اللہ البالغہ لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی،

علماء میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ کا پایہ بہت بلند ہے، اور وہ دوسرے ممالک کے بڑے سے بڑے علماء کے ہم پلہ قرار دیے جا سکتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ ہندوستان میں ہر قسم کی سرپرستی کے باوجود کوئی امام غزالی یا ابن تیمیہ یا ابن مسکویہ یا ابن خلدون پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے، ان میں بہت سے ایسے گذرے ہیں جو دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی صف میں رکھے جا سکتے ہیں، مغل بادشاہوں کی حکومت اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کی طاقتور ترین اور متمدن ترین حکومت سمجھی جاتی تھی، اگر ہندوستان کے علماء بھی اسی درجہ کے اور اسلامی ممالک کے علماء کے ہم پایہ ہوتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی، ذہنی، نظری اور فکری نشو ونما اور نہج پر ہوتی، جب یورپ میں محققین ہر قسم کے علوم و فنون پر کتابیں لکھ کر نئے نظام حیات اور نئے مقصدِ زندگی کے لیے اپنی اپنی قوموں کو تیار کر رہے تھے، اس وقت

Marfat.com

ہندوستان کے علماء صرف ایسی کتابیں لکھتے رہے جن سے عام مسلمان زیادہ مستفیض نہیں ہو سکے، اور پھر یہ عجیب بات رہی کہ مذہبی زبان عربی تھی، سلاطین اور امراء کی زبان ترکی یا فارسی تھی، اور عوام خصوصاً ہندی الاصل مسلمان یہاں کے باشندوں کے میل جول سے ایک نئی زبان بولنے کے عادی ہو رہے تھے، علماء یا تو عربی یا فارسی زبان میں تصنیف وتالیف کرتے جس کی زبان اتنی مشکل ہوتی کہ وہ جو کچھ لکھتے خواص ہی تک محدود رہ جاتا، اور پھر اُن کی تقلید جامد کی وجہ سے اُن میں کوئی انقلابی اور فکری چیزیں بھی نہ ہوتیں،

تقلید جامد کے فوائد۔ گو تقلید جامد سے نقصان پہنچا لیکن اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ ہندوستان کے علماء جن تقلیدی اصولوں کے پابند تھے، جمہور مسلمانوں کو بھی ان کا پابند کرانے کی کوشش کرتے رہے اور چونکہ خود ان کے عقائد میں جدت نے راہ نہیں پائی تھی، اس لیے عام مسلمانوں کے عقائد میں بھی بے راہ روی کے پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، اور جب بھی اسکا خطرہ پیدا ہوا علما نے اس کے انسداد کی پوری کوشش کی، ان کی یہ کوشش رائگاں نہیں ہوئی، وہ مسلمانوں کو بدعات اور محدثات سے کلیتہً تو باز نہ رکھ سکے، لیکن ان میں اپنے مذہب کے احترام کا جذبہ برقرار رکھا، اسی لیے مختلف زمانوں میں اباحیتوں کا شور، کبیر کی تحریک مہدویت کا ہنگامہ، فرقۂ روشنیہ کا فساد اور دین الٰہی کا فتنہ اٹھا، لیکن وہ سب دب کر رہ گئے، اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی مذہبی روایتوں کو جس طرح سینہ سے لگائے رکھا ہے، اور اس کے لیے جو جانی اور مالی قربانیاں کرتے رہے ہیں اس کی مثالیں دوسری جگہ کم ملیں گی، ان کے یہی جذبات واحساسات

Marfat.com

ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں جن سے ضرورت کے وقت حکمران طبقہ برابر فائدہ اٹھاتا رہا اور ان مذہبی جذبات کو ابھار کر ان کو بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا دیتا، اس طرح مسلمانوں کے مذہبی شعور کو قائم رکھنے میں علماء کا جو فیض ہے، وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا،

نقصانات لیکن ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ روایت اور تقلید پسندی سے مذہبی مفاہمت اور مصالحت کم ہوتی گئی، جس کے تلخ نتائج بھی پیدا ہوئے، علماء صوفیہ سے لڑے، حنفی شافعی سے الجھے اور سنی شیعہ جس طرح برسرپیکار رہے، وہ تاریخ کی بہت ہی المناک داستان ہے۔

روشن پہلو لیکن ان جھگڑوں کا بھی ایک روشن پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی غیرت اور دینی حمیت برابر زندہ رہی اور جب وہ اپنے مذہب کے مختلف فرقوں کے عقائد سے مفاہمت اور مصالحت نہیں کر سکے تو غیر مسلموں کے عقائد و تصورات سے اجتماعی طور سے متاثر ہونے کا امکان ہی نہ تھا، جس سے ان کی مذہبیت باقی رہی، اور ہندوستان کی ایک کثیر آبادی کے ساتھ گھل مل کر رہنے کے باوجود.....

ان کی انفرادیت بھی برقرار رہی، حالانکہ اس آبادی میں ان سے پہلے دوسری قومیں ضم ہو چکی تھیں، اسی لیے آج یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے میں کیوں جذب نہ کر سکے؟ اس کی بڑی وجہ ان کا مذہبی ذہن اور دینی شعور رہا ہے، جو علماء کی وجہ سے قائم رہا، اور جس کو اسلام کا نام لے کر حکومت کرنے والے سلاطین برابر زندہ کرتے رہے، جس میں اُن کا ذاتی اور سیاسی مفاد بھی شامل ہوتا، اور مسلمانوں نے بھی اپنی مذہبی فلاح اور سیاسی بہبود کی خاطر دونوں کا ساتھ دیا،

گو دونوں کے ظاہری اور اندرونی مطمحِ نظر میں جو فرق رہا، اس سے وہ خود بڑی کشمکش اور آزمایش میں مبتلا رہے،

تمدنی کشمکش، اور یہ کشمکش ان کی تمدنی زندگی خصوصاً مغلوں کے دور میں زیادہ رہی

مغلوں کی تاریخ کا یہ پہلو عجیب و غریب ہی، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بادشاہ تو سنی ہوتے لیکن وزارت اور کلیدی جگہیں زیادہ تر شیعی امراء کے ہاتھوں میں رہیں، خانخانان بیرم خان، خانخانان عبدالرحیم خان، خانخانان منعم خان، فتح اللہ شیرازی، اعتماد الدولہ، مرزا غیاث بیگ طہرانی، آصف خاں، ابوالحسن مشہور بہ آصف جاہی، امیر الامراء شائستہ خاں، میر جملہ اصفہانی، قطب الملک سید عبداللہ امیر الامراء سید حسین، برہان الملک، نجف خاں اور صفدر جنگ وغیرہ کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، ساداتِ بارہہ تو مغلوں کی فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ان شیعی عمائد کے حسن ذوق کی وجہ سے مسلمانوں کی تمدنی اور ادبی زندگی میں جو دل آویز رنگا رنگی پیدا ہوئی، ان کو شیعہ سنی جھگڑوں میں الجھ کر نظر انداز کر دینا ایک تاریخی حقیقت سے منہ موڑنا ہے، اور محض ان کے تاریک پہلو پیش کرتے رہنا انصاف نہیں،

ان شیعی امراء کے با اقتدار ہونے کے باوجود صدر الصدور شیخ الاسلام اور قضاۃ کے عہدوں پر زیادہ تر سنی علماء ہی فائز ہوتے رہے، ان کے فیصلوں کے سامنے شیعی امراء کو بھی جھکنا پڑتا، صدر یا صدر الصدور کی اہمیت تقریباً وکیل السلطنت امیر بخشی اور میر سامان ہی کے برابر ہوتی، گو اس کی نوعیت صدر کی ذات اور قوت کے لحاظ سے بدلتی رہتی، وہ علماء کی سرگرمیوں پر نگرانی رکھتا، ان کو وظائف دیتا، ان کے

Marfat.com

درس وتدریس کی نوعیت کی دیکھ بھال کرتا رہتا، عام لوگوں کی مذہبی، تعلیمی اور اخلاقی حالات کا احتساب کرتا رہتا، قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر کرتا، اور وہی صدر اچھا سمجھا جاتا جو شرعی قوانین کا نفاذ کرانے میں پیش پیش رہ کر اسلام کی عزت و وقار کو بڑھاتا رہتا، عہد اکبری کے صدر شیخ گدائی کنبوہ، خواجہ محمد صالح، شیخ عبدالنبی، سلطان خواجہ تھے، جہانگیر کے عہد میں میران صدر جہاں پہانی اور موسوی خاں تھے، شاہ جہاں کے دور میں سید صدر جلال بخاری اور سید ہدایت اللہ رہے، ملا عبدالنبی اپنی سختی کے لیے بدنام تھے، میران صدر جہاں پہانی کے بارہ میں مشہور ہے کہ انھوں نے مدد معاش کے سلسلہ میں اتنی فیاضی دکھائی کہ جہانگیر سے آصف خاں جعفر کو کہنا پڑا کہ عرش آشیانی یعنی اکبر نے جو بخشش پچاس سال میں کی تھی، صدر جہاں نے اپنی پانچ سال کی صدارت میں کی، اورنگ زیب کے زمانہ میں قاضی عبدالوہاب شیخ الاسلام بھی ہوئے، وہ شرعی احکام کے نفاذ میں بڑی سختی کرتے جس سے بعض امرا ان سے بدظن رہتے تھے، لیکن عالمگیر کو ان کے زہد و تقویٰ پر برابر اعتماد رہا، مآثر الامرار کے مولف کا بیان ہے کہ قاضی عبدالوہاب کے زمانے میں نظمِ شریعت کی اتنی پابندی رہی کہ پہلے نہیں ہو سکی تھی،

قاضیوں اور مفتیوں سے یہی توقع رکھی جاتی تھی، کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں رہکر شرعی احکام کا نفاذ کراتے رہیں گے لیکن سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے زمانے کے قاضیوں کی تین قسمیں بتائی تھیں، ایک وہ جو سلطان وقت سے نہیں ڈرتے اور خدا سے ڈرتے ہیں، دوسرے وہ جو سلطانِ وقت سے ڈرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے، اور تیسرے وہ جو نہ سلطان وقت اور نہ خدا سے ڈرتے ہیں، یہ قسمیں

مغلوں کے زمانے میں بھی رہیں،

مسلمانوں کی اکثریت سنیوں کی تھی، سنی علماء نے ان کے جذبات سے فائدہ اٹھاکر تخت وتاج کا مالک سنی حکمراں ہی کو بنائے رکھا، عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ شیعی عقائد کے لیے مشہور ہوگیا تھا، اس نے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ وصی کا لفظ بھی پڑھنے کا حکم دیا، لیکن علماء نے اس لفظ کے اضافہ سے انکار کردیا، احمد آباد میں بلوہ ہوگیا، لاہور میں خطبہ پڑھنا ہی رک گیا، اور جب بہادر شاہ خود لاہور پہنچا تو اس نے علماء کو بلاکر ان سے مناظرہ کیا، ان میں سب سے جری مولانا حاجی یار محمد تھے، جنھوں نے بڑی جرأت سے بہادر شاہ کے تمام دلائل کو رد کیا۔ حاضرین میں کسی نے ان سے کہا کہ وہ بادشاہ کی تعظیم میں فرق نہ آنے دیں، ورنہ اس کی سزا بھگتنی ہوگی، انھوں نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ ان کو چار چیزوں کی آرزو تھی، تحصیل علم، حفظ کلام پاک، زیارت خانۂ کعبہ اور شہادت، الحمد للہ کہ تین آرزوئیں تو پوری ہوگئی ہیں، ایک رہ گئی تھی، وہ اب پوری ہوجائے گی، یہ مناظرہ کئی روز تک گرم رہا، بہادر شاہ مصر تھا کہ خطبہ اسی کی خواہش کے مطابق پڑھا جائے اس لیے اس نے جامع مسجد کے خطیب کو گرفتار کرکے لاہور سے آگرہ بھیج دیا، اور مسلح فوج شہر میں تعینات کردی، لیکن جمعہ کے روز شہر کے تمام لوگ امنڈ پڑے مولانا حاجی یار محمد کی اعانت میں ایک لاکھ عوام تھے، ان ہی کے سہارے علماء غالب آئے، اور جمعہ میں وہی خطبہ پڑھا گیا جو عالمگیر کے زمانے میں پڑھا جاتا تھا، بہادر شاہ کو علماء اور عوام کی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا،

سنی مسلمانوں کی اکثریت ہی کی بنا پر سادات بارہہ بادشاہ گر ہونے کے

Marfat.com

باوجود تخت پر ایسے ہی حکمراں کو بٹھاتے جو سنی ہوتا، لیکن محل کے اندر مغل بادشاہوں کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر شیعہ بیگمات اور راجپوت شہزادیوں کا استیلا رہا، ہمایوں، اکبر اور عالمگیر تینوں شیعہ ماؤں کی بطن سے تھے، اکبر کے محل میں سنی بیگمات بھی ضرور رہیں، لیکن اس کی ماں حمیدہ بیگم شیعہ ہونے کی وجہ سے اپنے خاندانی روایات کی پابند رہی، پھر اسی محل میں راجہ بہارامل کچھواہہ کی بیٹی اکبر کی بیوی بن کر آئی تو اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کے ساتھ راجپوت تمدن لائی، جہانگیر کی بیویاں سنی بھی تھیں، لیکن مختلف اوقات میں گیارہ راجپوت شہزادیاں بیاہ کر کے آئیں اور محل کی رانیاں بن کر رہیں، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے ساتھ بھی راجپوت تمدن آیا، لیکن آخر میں نورجہاں محل میں حاوی ہوگئی، شاہجہاں کی تین بیویاں ممتاز محل (نورجہاں کی بھتیجی) قندھاری محل (مرزا مظفر حسین صفوی کی بیٹی) اور ایک خانخانان عبدالرحیم کی پوتی شیعہ ہی تھیں، عالمگیر کی پہلی بیوی دلرس بانو بھی شیعہ تھی، جو شاہ نواز خاں صفوی کی لڑکی تھی، پھر اس کی دو اور بیویاں نواب بائی (راجہ راجو کی بیٹی) اور اودے پوری محل راجپوت شہزادیاں تھیں، اسی طرح فرخ سیر کے عہد تک راجپوت شہزادیاں محل میں آکر رانیاں بن کر رہیں،

اکبری عہد میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محل کے اندر راجپوت تمدن ہی چھا جا ئیگا، محل کے اندر مندر بھی تعمیر ہوئے، ہنومان جی کے بت بھی رکھے گئے، تلسی پوجا کے لیے پتھر کا ایک تھانولا رکھوا کر اس میں ترسا کا درخت بھی لگایا گیا، فتح پور سیکری کے محل میں دیواروں پر گنیش جی، کرشن جی اور رام چندر جی وغیرہ کی تصویریں بھی نظر آنے لگیں، لیکن جہانگیر کے زمانے میں نورجہاں نے شاہی محل میں آتے ہی اپنے

Marfat.com

حسنِ ذوق سے محل کے اندر کا سارا تمدنی رنگ ہی بدل دیا، پہننے، اوڑھنے، بناؤ سنگار، فرش فروش اور زیور و آرایش کی چیزوں میں اتنی جدتیں پیدا کیں کہ پوری سلطنت میں یہی رنگ غالب آگیا، نورجہاں نے محل کی دوسری بیگمات کے نہ صرف چراغ بے نور کر دیئے بلکہ محل کے اندر کے تہذیب و تمدن کا رخ ہی موڑ دیا،

دربار میں سنی شیعہ بیگمات اور راجپوت شہزادیوں کے اعزہ واقربا نمایاں ہوئے جو دربار کو اپنے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، لیکن نورجہاں اور ممتاز محل کے رشتہ دار اپنے ایرانی اثرات کے ساتھ دربار پر ایسا چھا گئے کہ خود راجپوت سرداروں اور سنی امرا نے ان ہی کے تمدن کو بڑی حد تک قبول کر لیا، محل اور دربار دونوں جگہ نہ صرف راجپوت سرداروں بلکہ غیر ایرانی امرا کا تمدن بھی دب کر رہ گیا، اور اسی تمدن کو مسلمان خواص اور عوام دونوں نے اپنے سینہ سے لگایا، اور اس کو وہ غلط یا صحیح اسلامی تمدن سمجھتے رہے، گو آگے چل کر یہ انڈو مسلم تمدن کہلایا،

اس میں شک نہیں کہ محل کے اندر بیگمات جتنے زیورات استعمال کرتی رہیں وہ سب کے سب راجپوت شہزادیوں ہی کے لائے ہوئے تھے، لیکن ایرانی مذاق کے مطابق ان میں ایسی نفاست اور لطافت پیدا ہوتی رہی کہ رفتہ رفتہ ہندو اور مسلمان عورتوں کے زیورات میں نمایاں فرق ہوتا گیا، اسی طرح محل کے اندر پیدائش اور شادی بیاہ کے رسوم بھی خالص ہندوستانی تھے، ان تقریبات میں صحنک، ساچق، حنابندی، بارات کے جلوس، گیت راگ، باجے، رقص و سرود وغیرہ بڑی دھوم دھام سے ہوتے، یہ سب ہندوستانی چیزیں ہیں، لیکن ان پر بھی ایرانی ذوق کی ایسی چھاپ پڑی کہ ان میں بھی ہندو مسلمان کے اثرات علٰحدہ علٰحدہ نظر آنے لگے، لیکن اس کے باوجود

Marfat.com

علماء اس تمدن سے مطمئن نہ تھے اور وہ دربار کی ہر چیز کی زینت و آرایش کو بھی غیر اسلامی قرار دیتے رہے، لیکن جس وقت ایرانی ذوق کے مطابق دیوان عام میں دربار لگتا اور اس میں طرح طرح کے اعلیٰ فرش و فروش لگائے جاتے، قالین بڑی نفاست اور لطافت سے بچھائے جاتے، حجروں اور ایوانوں پر طلادوزی، کلابتون، مخمل اور زربفت کے پردے لٹکتے رہتے، دربار میں چاندی اور سونے کے کٹگھرے بنائے جاتے، ہر طاق میں زرین کوکبہ، طلائی زنجیر کے ساتھ آویزاں رہتا، تخت کے سامنے ایک زرنگار شامیانہ لگایا جاتا جو موتیوں سے مرصّع رہتا، تخت کے دونوں طرف چتر ہوتے جن میں قیمتی موتی لگے ہوتے، تخت کے پیچھے صندلیاں ہوتیں، ان کے اوپر جواہر نگار شمشیریں، مرصع ترکش اور نیزے رکھے رہتے، ایوانوں کی چھتوں، ستونوں، دروازوں اور دیواروں میں مخمل اور زربفت کے زرنگار پردے لگے ہوتے، جن میں کلابتون اور بادلہ کی بڑی کاریگری ہوتی۔ ایوان کے سامنے صحن میں مخمل اور زربفت کی ایک بارگاہ کھڑی کیجاتی، اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے مرصع خیمے لگائے جاتے تو مسلمان عوام و خواص دونوں ان کو دیکھ دیکھ کر اپنی تمدنی برتری پر پھولے نہیں سماتے۔

دیوان خاص میں تخت طاؤس رکھا رہتا، اس کے اوپر ایک چھت دی گئی تھی، جس کے اندرونی حصہ میں بڑی ترصیع اور میناکاری کی گئی تھی، اس کے بیرونی حصہ میں لعل و یاقوت جڑے گئے تھے، اور اس کو زمرد کے بارہ ستونوں پر قائم کیا گیا تھا، چھت کے اوپر دو مرصع طاؤس بھی تھے، جن کی گردنوں میں بڑے بڑے قیمتی موتی لٹکائے گئے تھے، دونوں طاؤس کے درمیان ہیرے، لعل، زمرد اور موتیوں سے مرصع ایک درخت بنایا گیا تھا، تخت پر چڑھنے کے لیے تین پایے کی ایک سیڑھی تھی جس کو

جواہرات سے آراستہ کیا گیا تھا تخت کے گرد تکیہ لگانے کے لیے گیارہ مرصع "تختے" تھے جن میں سے درمیان کا "تختہ" جس پر تکیہ لگا کے بادشاہ بیٹھتا تھا، دس لاکھ روپے کی قیمت کا تھا۔ اس تخت کو دیکھ کر مسلم، غیر مسلم سب ہی کو ایک اعلیٰ تمدن کا احساس پیدا ہوتا تھا،

محل اور دربار میں عید الفطر اور عید اضحیٰ میں جو تقریبات منائی جاتیں اُن میں بھی جتنی آرائش ممکن ہوتی کی جاتی، دربار اور محل دونوں کو گلزار بنا دیا جاتا، جھاڑ، فانوس، قمقمے، سفید اور رنگین کافوری شمعوں اور قندیلوں سے ایوانوں کی چھتوں کو منور کر دیا جاتا، عود اور عنبر کی نکہت بیزیوں سے فضا معطر ہو جاتی، تو ارباب نشاط طلب کیے جاتے اور اپنے پُرکیف سرود اور ہوش ربا رقص سے پوری محفل کو مست کر دیتے، اور انعام واکرام سے نوازے جاتے، نوروز کا غیر اسلامی تہوار اس سے بھی زیادہ پُرشکوہ طریقہ سے منایا جاتا، اور مسلمان ان ہی میں اپنی تمدنی عظمت کے جلوے دیکھتے، محل کے اندر شہزادیاں دودھ اور گلاب سے نہاتیں، ان کے غسل خانوں میں سنگ مرمر کی استرکاری اور منبت کاری ہوتی، ان کی زلفوں کو سنوارنے میں عنبر، عود، سنبل الطیب، مشک، بیب، لوبان، گلاب اور نارنگی کے پھولوں کے سفوف دیے جاتے، ان کے لباس پوشاک میں اتنے جواہرات ہوتے کہ آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جاتیں، کھانا سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھائے جاتے، دسترخوان پر اتنے کھانے چنے جاتے کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی تھی، امرا کے محلوں میں شاہی محل کی طرح فوارے، حمام، اور باغ ہوتے، ان کے یہاں بھی کھانے میں تکلفات کی کوئی حد نہ ہوتی، ان کے لباس میں بھی پوری شان وشوکت دکھائی دیتی،

Marfat.com

ان کی بھی سواری نکلتی تو ان کے جلو میں خدم و حشم ہوتے، ان کی معاشرتی زندگی میں بھی راگ ونغمہ کی فراوانی ہوتی، ان کی تقلید علمام مسلمان کرتے، ان کی روزمرہ کی زندگی تو ایسی نہ ہوتی لیکن خاص خاص تقریبات کے موقع پر ان تکلفات کا مظاہرہ کرکے خوش ہوتے، علما، اس تمدنی اور معاشرتی زندگی کو پسند نہیں کرتے، اور ان کو عہد رسالت کے تمدن کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں بار بار فرمایا کہ زندگی کی کامیابی حضرت محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی پوری متابعت میں ہے، ع

کار این است غیر ایں ہمہ ہیچ

انھوں نے اس کی بھی تلقین کی کہ آدمی کو لذیذ کھانوں اور نفیس کپڑوں کے لیے دنیا میں نہیں لایا گیا، وہ عیش وعشرت اور کھیل کود کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ عجز وانکسا بندگی کی حقیقت ہے، منہیات میں مبتلا ہو کر زندگی بسر کرنا قیمتی عمر کو بیہودہ چیزوں میں ضائع کرنا ہے، وہ سرود ونغمہ کو زندگی کے لیے ایک قسم کا شہد سے ملا ہوا زہر اور شکر سے آلودہ سم قاتل بتاتے رہے، شیخ فرید بخاری کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ سونے چاندی، ریشمی کپڑے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے، ان سے بچتے رہنا چاہیے، چاندی کے ظروف کو اگر سجانے کے لیے استعمال کیا جائے تو گنجایش نکل سکتی ہے، لیکن ان کا استعمال حرام ہے، مثلاً ان میں پانی پینا، کھانا کھانا، عطریات ڈالنا، سرمہ دانی بنانا وغیرہ، حق سبحانہ وتعالیٰ نے امور مباحہ کے دائرے کو بڑا وسیع کر دیا ہے، ان کے تنعمات وتمتعات سے جو لذت عیش حاصل ہوتی ہے، وہ امور محرمہ سے کہیں زیادہ ہے، مباحات میں خدا کی

Marfat.com

رضا و خوشنودی ہے، محرمات میں ناراضگی و خفگی۔ اسی طرح عبدالرحیم خانخاناں کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ماکولات، مشروبات اور ملبوسات میں بہت سی چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور صرف تھوڑی سی چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ بھی بندوں کے فائدے ہی کے لیے۔ بعض ریشمی کپڑوں کو حرام کیا ہے تو کیا مضائقہ ہے کیونکہ اس کے بدلے تو کتنے قسم کے مزین کپڑے اور لباس حلال کر دیے ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم ان کے علوم و معارف کے شارح بن کر سنت محمدیہ کے احیاء اور مسلمانوں کی تجدید اصلاح اور تہذیب اخلاق میں جد و جہد کرتے رہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی معاشرت و تمدن کو سنوارنے کے لیے احیائے سنت کو ضروری قرار دیا، اسی لیے انھوں نے فارسی زبان میں احادیث منتقل کرنی شروع کیں تاکہ ان سے عوام و خواص بہرہ ور ہوں، انھوں نے جہانگیر کے لیے ایک رسالہ نورانیہ سلطانیہ تصنیف کیا، جس میں بادشاہ کے فرائض اور سلطنت کے قواعد ارکان پر بحث کی، پھر شاہ جہاں کے لیے انھوں نے ایسی چالیس حدیثیں جمع کیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کو نصیحت فرمائی ہے، پھر تمام علماء کے سامنے یہ مثال بھی تھی کہ ایران اپنے تمدن کی بے جا شان و شوکت ہی کی وجہ سے تباہ ہوا تھا، عہد فاروقی میں صحابہ کرام نے ایرانی تمدن کے تمام تکلفات کو بڑی حقارت سے دیکھا تھا، ایران میں جنگ قادسیہ کے موقع پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اپنے سفراء ایرانی دربار میں بھیجے، لیکن جب وہ دربار کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے گھوڑوں پر زین اور ہاتھوں میں ہتھیار تک نہ تھے، اور وہ دربار میں نہایت سادہ طریقہ پر عربی جبے پہنے، کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے،

Marfat.com

ہاتھوں میں کوڑے لیے پہنچے، اس ہیئت گذائی کے باوجود ایرانی بادشاہ یزدگرد پر ایک ہیبت طاری ہوگئی، اسی سلسلہ میں ربعی بن عامر بھی مزید گفتگو کے لیے یزدگرد کے دربار میں پہنچے تو ان کی سادگی کا حال اور بھی عجیب وغریب تھا، انھوں نے عرق گیر کی زرہ بنائی، اسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ لیا، کمر میں رسی کا پٹکا باندھا اور تلوار کے میان پر چیتھڑے لپیٹ لیے، . . . . اور گھوڑے پر سوار ہوکر نکلے، ادھر ایرانیوں نے بڑی شان وشوکت سے دربار سجایا، دیبا کا فرش، زرین گاؤ تکیے، اور حریر کے پردے لگائے، صدر میں مرصع تخت رکھا۔ ربعی آئے تو فرش کے قریب آکر گھوڑے سے اترے اور باگ ڈور کو گاؤ تکیے سے لگا دیا، اور نہایت بے پروائی سے آہستہ آہستہ تخت کی طرف بڑھے۔ برچھی ہاتھ میں تھی، اس سے عصا کا کام لے رہے تھے، اس کی انی کو اس طرح فرش پر چبھوتے جاتے تھے کہ پرتکلف فرش اور قالین جابجا سے کٹ کٹ کر بیکار ہوگئے، تخت کے قریب پہنچکر زمین پر نیزہ مارا، جو فرش کو آرپار کر کے زمین پر گڑ گیا، تمام درباری دم بخود تھے، ربعی کے بعد مغیرہ اسی دربار میں بھیجے گئے، تو اس دن ایرانیوں نے اور بھی زیادہ دربار کو سجایا، تمام درباری تاج زرین پہنکر بیٹھے، خیمے میں دیبا د سنجاب کا فرش بچھایا گیا، خدام قرینے سے دو رویہ پرے جما کر کھڑے ہوئے، مغیرہ گھوڑے سے اتر کر سیدھے صدر کی طرف بڑھے، اور ساری آرایش کو حقارت کی نظر سے دیکھا، اور اپنے میزبان کے زانو سے زانو ملا کر جا بیٹھے، اس پر تمام دربار برہم ہوا، یہاں تک کہ چوبدار نے بازو پکڑ کر ان کو تخت سے اتار دیا، لیکن مغیرہ نے بڑی بے باکی سے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ ہم پہلے تمھارے قصے سنتے تھے،

لیکن آج مجھے تم سے زیادہ احمق قوم نظر نہیں آتی، یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے خود مجھے بتا دیا کہ تم میں بعض لوگ بعض لوگوں کے خدا ہیں، اب تمہاری سلطنت قائم نہیں رہ سکتی، میں نے اس راز کے انکشاف کے لیے خود کوئی کوشش نہیں کی تم نے مجھے بلایا تو معلوم ہوا کہ اب تم لوگ مغلوب ہو گئے،

علمار صحابۂ کرام کی سادگی، شان بے نیازی، طہارتِ باطنی اور ایثار پسندی کے بلند نمونے اپنے مواعظ میں خاص و عام کے سامنے پیش کرتے رہے، لیکن وہ اثر انداز نہ ہو سکے، عالمگیر کے علاوہ اور سلاطین نے اس تمدن کو اس لیے نہیں چھوڑا کہ اس سے ان کے خیال کے مطابق ان کی شاہانہ شوکت اور سطوت قائم ہوتی تھی، امرار سلاطین کی پیروی کرتے، اور اسی کے ذریعہ ان کو جاہ اور مرتبہ حاصل ہوتا رہا، لیکن عام مسلمان علمار کے احتجاج کے باوجود اس پر اس لیے فخر کرتے رہے کہ یہ تمدن ایک مسلمان بادشاہ کی نگرانی میں فروغ پا رہا تھا، اور ان کے دربار اور محل کے علاوہ کہیں اور مشکل سے نظر آتا، اس سے ان میں اپنی تمدنی فوقیت اور معاشرتی برتری کا احساس پیدا ہوتا رہا، اور غلط یا صحیح اس سے بحث نہیں، اس فوقیت اور برتری میں اسلام کی فوقیت اور برتری بھی تصور کرتے رہے، وہ مسلمان بادشاہوں کے وقار کو اسلام کا وقار، ان کی حربی فتح و کامرانی کو اسلام کی فتح و کامرانی ان کی ذلت کو اسلام کی ذلت اور ان کی شکست کو اسلام کی شکست تصور کرنے کی عادی ہو گئے تھے، ان کے سوچنے کا یہ ڈھنگ ان کے اور شعبۂ زندگی میں بھی رہا، حتیٰ کہ موسیقی میں بھی کسی مسلمان ماہر فن کی فتح کسی غیر مسلم صاحب کمال پر ہو جاتی تو اس سے بھی ان کے ذہن کو بڑی تسکین ہو جاتی، محرم کا جلوس اگر

Marfat.com

دسہرہ کے جلوس سے بڑھ جانا، یا شب برات کی آتش بازی دیوالی کی روشنی سے دلفریب ہو جاتی تو بھی ان ہی جذبات کی بنا پر خوش ہوتے، وہ علماء کے سمجھانے پر بدعت کو بدعت یا غیر اسلامی چیز کو غیر اسلامی اس وقت تک سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے جب تک ان کے ذریعہ سے ان کی سیاسی، اجتماعی، تمدنی اور معاشرتی بڑائی اور سطوت قائم ہوتی رہی، اسی لیے علماء کی تعلیم و تلقین کے باوجود وہ بھی سلاطین و امراء کی تمدنی زندگی کی شان و شوکت پر ناز کرتے رہے،

لیکن یہ تمدن اسی وقت تک مفید ثابت ہوا جب تک کہ تخت و تاج کو بیدار مغز، ہوشمند اور تلوار کے دھنی سلاطین اور امراء ملتے رہے، شمشیر و سنان کی جھنکار کے نیچے طاؤس و رباب کی نشاط انگیزیاں دبی رہیں، لیکن آگے چل کر طاؤس و رباب اوّل اور شمشیر و سنان آخر ہو گئے عالمگیر کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ یہ عیاشانہ تمدن اپنی افراتفری میں فاسقانہ اور فاجرانہ رنگ لا رہا ہے، اس نے ان پر پابندی عائد کر کے مسلمانوں کے اسلامی ذہن و شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اس سے علماء کو اپنی بیدار مغزی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، اور وہ ان کا ازالہ صحیح طور پر کرتے تو کیا عجب تھا، کہ عام مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی استواری عالمگیر کے جانشینوں کی نااہلی کا کفارہ بن جاتی،

علماء اور امراء لیکن علماء سلاطین سے بددل اور آزردہ ہوتے تو مسلمان عوام کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے، مسلمان امراء کی طرف مائل ہوتے، اور ان ہی کے ذریعہ سلاطین کو درست کرنے کی کوشش کرتے، اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس زمانہ میں عوام کی وہ حیثیت نہ ہونے پائی تھی جو اب ہے، یا ان کی اجتماعی تنظیم

آسان نہ تھی، یا وہ اتنے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتے تھے، جیسے کہ امراء ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ تخت کا تختہ بھی الٹ سکتے تھے، اسی لیے علماء عوام کے بجائے اچھے امراء سے تعاون کر کے سلاطین وقت کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے، علاء الدین خلجی کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے اور مذہبی بے راہ روی سے روکنے میں علاء الملک کوتوال کا بڑا ہاتھ تھا، جس کے لیے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی دعاے خیر کی، جہانگیر کے عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس دور کے امراء میں خانجہاں، شیخ فرید مرتضیٰ خان بخاری، خواجہ جہاں، قلیچ خان، خان اعظم، صدر جہاں، مہابت خاں وغیرہ جیسے جلیل القدر علماء کو خطوط لکھ کر نہ صرف ان کو ہدایت و تلقین کرتے رہے، بلکہ بادشاہ وقت کی اصلاح کے لیے بھی ان کی توجہ مبذول کرائی، اسی طرح آخر وقت میں نجیب الدولہ اور نظام الملک کی اعانت سے شاہ ولی اللہ نے مغل دربار اور سیاست کا رنگ بدلنا چاہا تھا،

اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں بعض ایسے امراء گذرے ہیں جو بڑے قابل قدر تھے، بلبنی عہد میں کشلی خاں کے دربار میں مصر، شام، روم، بغداد اور خراسان وغیرہ سے سفراء اور فضلاء اس کی بخشش کا شہرہ سن کر اس کے یہاں آتے اور انعام و اکرام سے مالامال ہو کر اپنے وطن واپس جاتے، اسی عہد کا ایک دوسرا فیاض امیر ملک علی سرجاندار تھا، جو اپنی فیاضی کی وجہ سے حاتم خاں کہلاتا، فقیروں کو خیرات میں سونے اور چاندی کے ٹنکے تقسیم کرتا، اور حنبیل کا نام زبان پر لانا ننگ سمجھتا، اس عہد کا ایک اور امیر ملک الامراء فخر الدین تھا، جس کے یہاں بارہ ہزار وظیفہ خوار کلام پاک پڑھنے

کے لیے تھے، جو ہر روز ایک ہزار بار کلام پاک ختم کرتے، وہ ہر سال ایک ہزار غریب لڑکیوں کے لیے جہیز کا بھی سامان فراہم کرتا، امیر خسرو کے نانا عماد الملک شمس الدین التمش کے عہد سے بلبنی دور تک عرض ممالک کے عہدہ پر فائز رہے ان میں گوناگون خوبیاں تھیں، وہ اپنے دفتر کے کام کرنے والوں کو اپنے پاس بلاتے، وہاں رکھتے، خلعت دیتے اور ان کو بیس بیس ہزار ٹنکے اپنی تنخواہ میں سے دیدیتے، دسترخوان بچھتا تو انواع و اقسام کے کھانوں کے خوان آتے، امراء و ملوک کے علاوہ جو بھی موجود ہوتا کھانے میں شریک ہوتا، اگر کھانا بچ جاتا تو غرباء میں تقسیم کر دیا جاتا، مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ نیک کاموں میں انھوں نے اتنے گاؤں وقف کیے تھے کہ فیروز شاہی عہد تک لوگ ان کے اوقاف سے گذر اوقات کرتے تھے، اور ان کے ایصال ثواب کے لیے کلام پاک پڑھتے رہتے تھے، وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، اسی لیے امیر خسرو کو بہت ہی کمسنی میں انکی آغوش شفقت میں دیدیا تھا جن سے ان کو آخر میں ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ از راہ لطف و کرم فرماتے کہ بہشت میں امیر خسرو کے بغیر نہ داخل ہونگا، عماد الملک کا شمار اپنی مذہبیت کے باوجود سلطنت کے چار ستونوں میں ہوتا تھا،

سلطان فیروز شاہ تغلق کا لائق وزیر خانجہاں حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرید تھا، اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق برابر باوضو رہتا، شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ وہ بڑا خدا ترس تھا، ہر وقت رعایا کی بہتری و فلاح کی کوشش میں لگا رہتا، کسی شخص پر ذرہ برابر بھی ظلم روا نہ رکھتا، ہر وقت رعیت کی راحت رسانی میں سرگرم رہتا، کام کرنے والے گروہ کی حمایت کرتا، اور ان کے قصوروں کی پردہ پوشی کرتا،

اس کا انتقال ہوا تو تمام خلقتِ خدا نے اس کے لیے ماتم کیا، اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رح کے مزار کے قریب دفن ہوا،

فیروز شاہی عہد کا ایک دوسرا ممتاز ترین امیر امیرالامرار تاتارخان نہ صرف سپہ گری اور امورِ مملکت میں باکمال سمجھا جاتا تھا بلکہ اپنے زہد و عبادت اور اتباعِ شریعت کے لیے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، وہ بادۂ تصوف سے لذت آشنا ہونے کے علاوہ شرعی علوم میں بھی بڑی دستگاہ رکھتا تھا، اس کی صحبت میں اربابِ کمال کا مجمع لگا رہتا تھا، اور علمی مذاکرے ہوا کرتے تھے، اس کی فرمائش سے دو کتابیں تفسیر تاتارخانی اور فتاویٰ تاتارخانیہ تیار ہوئیں، تفسیر تاتارخانی تمام پچھلی عربی تفسیروں کا ایک مجموعہ ہے، اس میں ہر آیت کے متعلق قدیم مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، سب کو حوالے کیساتھ نقل کر دیا گیا ہے، اسی طرح فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہر مسئلہ کے متعلق قدیم ائمہ و علمار کے اختلافات جمع کر دیے گئے ہیں،

شاہانِ مغلیہ کے عہد میں بھی بعض بہت ہی اچھے امرار تھے، عبدالرحیم خانخانان کے دربار سے شیعی اور سنی دونوں علمار وابستہ رہے، ان میں مولانا میاں وجیہ الدین، مولانا غازی خان بدخشی، قاضی نصیر الدین برہانپوری، ملا خیر الدین رومی، مولانا جلال الدین حسن نیشاپوری، مولانا شیخ عبداللہ، مولانا شیخ ابراہیم، مولانا شیخ علم اللہ، مولانا صوفی، ملا محمد علی کشمیری، مولانا میر دوستی سمرقندی، میر عبدالباقی تبریزی، میر فیض اللہ ترخورانی، ملا خوشحال تاشکندی، مرزا محمد قاسم گیلانی، آقا جلال قزوینی، قاضی عبدالعزیز ہمدانی، مولانا محمد تقی کاشانی، مولانا مقصود علی تبریزی، مولانا محمد رضائی، تاج مشہدی اور حکیم کمال الدین حسین شیرازی

Marfat.com

قابلِ ذکر ہے، عبدالرحیم خان خانان کی خط وکتابت حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے بھی رہی، جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امارت کے باوجود اس کا دینی شعور بیدار تھا، اور وہ شیعہ سنی کے جھگڑوں سے بالاتر ہو کر دینی حمیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

جہانگیری امراء میں شیخ فرید مرتضیٰ خان بخاری کو بھی علماء اور مشائخ سے بڑا گہرا تعلق تھا، حضرت باقی باللہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ دونوں اس کی گوناگوں خوبیوں کے معترف تھے، اکبری عہد میں وہ بخشی کے عہدے پر مامور تھا، جہانگیر کی جانشینی میں اس کا بڑا دخل تھا، اسی لیے جہانگیر نے اس کو میر بخشی کا عہدہ عطا کیا، پھر گجرات اور پنجاب کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا، وہ اپنے گھر سے نکلتا تو راستہ میں مسکینوں کو کمل، چادر اور کپڑے تقسیم کرتا جاتا، کسی کو نقد روپیہ اور کسی کو اشرفی دیتا، بیواؤں اور حاجتمندوں کے لیے اس کے یہاں سے یومیہ، ماہانہ اور سالانہ وظیفے مقرر تھے، غریب لڑکیوں کی شادی کے جہیز کا سامان بھی کرتا، اس کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو سے ایک ہزار تک آدمی کھانا کھاتے تھے، اس میں بڑی دینی غیرت و حمیت تھی، اور وہ مذہبی شعار کو رواج دینے کے لیے بے چین رہتا، اکبر کے دینِ الٰہی کی مذہبی گمراہیوں کو دور کرنے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو تجدیدی اور اصلاحی اقدام اٹھائے، اس میں وہ بڑا معاون ہوا، اسی کے اصرار پر جہانگیر نے اپنی جانشینی کے بعد حکم دیا کہ ملکی نظم ونسق میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے، حضرت مجددؒ شیخ فرید کی ان مساعیِ جمیلہ کے ممنون رہے، اُس کی شان میں یہ شعر لکھتے ہیں:۔ ع

Marfat.com

گر بر تنِ من زبان شود ہر موئے — یک شکر تو از ہزار نتواں کرد

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو لکھتے ہیں کہ ہم فقیروں پر آپ کے احسانوں کا شکر لازم ہے، کیونکہ ہمارے حضرت خواجہ قدس سرہٗ کی ظاہری جمعیت کا سبب آپ ہی ہوئے تھے، اور اس جمعیت کی حالت میں آپ کے طفیل میں ہم نے حق سبحانہٗ کی طلب کی اور بہت فائدے حاصل کئے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی اس کو احیائے سنت و شریعت کے لیے برابر خطوط لکھتے رہے، مآثر الامرار کے مصنف نے اس کی بہت سی خوبیوں کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ اس کے ایسا آدمی پھر زمانہ نے ہندوستان میں پیدا نہیں کیا،

حضرت مجددؒ نے جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر خان اعظم کی دینی حمیت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا، اس کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے رکے ہوئے ہیں، اور ان احکام کے بجالانے پر مطعون ہیں شرعِ شریف کی رونق بادشاہوں پر منحصر ہے، لیکن اب قصہ برعکس ہوگیا ہے اور معاملہ بدل گیا ہے، ہائے افسوس! صد افسوس! ہم ایسے نازک وقت میں آپ کے وجودِ مبارک کو غنیمت جانتے ہیں، اس معرکۂ ضعیف میں آپ کے سوا کسی اور کو بہادر نہیں جانتے، آپ کے مسلمان ہونے کی عزت ہمسروں کی نظروں میں ظاہر ہے، کوشش فرمائیں کہ زیادہ نہ سہی تو اتنا تو ہو کہ اہل اسلام بیہودہ عملی باتوں سے محفوظ رہیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، پہلی حکومت میں دینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی مفہوم ہوتی تھی، اس حکومت میں ظاہری طور پر وہ عناد نہیں ہے اگر ہے، تو بے علمی کے باعث ہے، ایسا نہ ہو عناد و دشمنی تک نوبت پہنچ جائے اور مسلمانوں پر

Marfat.com

معاملہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہوجائے، حق تعالیٰ آپ کو اور ہم کو سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر ثابت قدم رکھے۔

جہانگیر کے امرا میں خانجہاں لودی بھی بڑا مذہبی واقع ہوا تھا، شیخ فضل اللہ برہانپوری کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، رات اکثر علماء اور صوفیہ کی صحبت میں گذارتا تھا، اس کی سرکار میں کسی قسم کی بدعت کا رواج نہ تھا،

مہابت خان کے لڑکے خان زمان بہادر مرزا امان اللہ کے بارہ میں مآثرالامرا کے مصنف کا بیان ہے کہ بجو بہادر امثال واقران سر برتری می افراخت۔

شاہجہانی عہد کے امرا میں افضل خاں، علامی شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خان اور دانشمند خاں میر بخشی کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں، یہ تینوں معقولات و منقولات کے عالم تھے، شاہجہاں کے عہد میں افضل خاں، علامی شکر اللہ شیرازی دیوان کل کے عہدے پر فائز ہوئے تو کسی نے تاریخ کہی۔ ع

شد فلاطون وزیر اسکندر

علامی سعد اللہ کی تقریر کی بلاغت اور تحریر کی فصاحت مشہور تھی، ان کے مذہبی معلومات، علمی لیاقت، حسن اخلاق، تواضع اور دیانت داری سے عہدہ وزارت کو وقار حاصل تھا،

عالمگیر اپنے میر بخشی دانشمند خان اور ملا شفیعائی یزدی کو ان کے علم و فضل اور نیک نفسی کی وجہ سے بہت عزیز رکھتا تھا، مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے،

"پس از وے حال از نوئیاں بلند مقدار کسے کہ فضیلت را با امارت جمع کردہ باشد در عرصۂ روزگار نماندہ۔"

Marfat.com

مغل بادشاہوں کے آخری دور میں نجیب الدولہ کے یہاں نو سو علما رہتے تھے، جو پانچ سو روپے تک وظائف پاتے تھے، اس نے نجیب آباد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، جو شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کا ایک زبردست مرکز تھا، شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی حکومت کو سنبھالنے کی کوشش میں اس سے بڑی مدد حاصل کی،

ان کے علاوہ بہت سے امراء ایسے بھی تھے جن کی سپہگری، جانبازی اور پامردی سے ہر زمانہ میں حکومت کو بڑی تقویت پہنچتی رہی، ان کے تدبر اور ہوشمندی سے حکومت کا وقار بڑھتا گیا، اسی لیے علماء ضرورت کے وقت ان سے مدد لیتے رہے،

لیکن مجموعی حیثیت سے امراء کا اخلاق اور کردار بہت زیادہ قابل تعریف نہیں رہا، اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں زیادہ تر امرا ایسے تھے، جن کی فوج اور حربی قیادت سے حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی، وہ حصار اور میدان کی لڑائیاں جس طرح لڑتے رہے، ہندوستان کی جنگی تاریخ کا غیر معمولی کارنامہ ہے، سندھ میں برہمن آباد کے قلعہ کا دور چار میل تھا، جو سد سکندری سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا، گوالیار کے قلعہ کے بارہ میں تاج المآثر کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ اتنا اونچا تھا کہ تیز اور تند ہوا بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، ارنگل کے قلعہ کے بارہ میں امیر خسرو لکھتے ہیں کہ اس کی دیوار اتنی سنگین تھی کہ لوہے کی اینٹ بھی اس سے زیادہ مضبوط نہیں بنائی جاسکتی تھی، سنگ مغربی اس سے ٹکرا کر واپس آجاتا تھا، رن تھنبور کی اونچائی اور مضبوطی کو دیکھ کر ابوالفضل متحیر ہوگیا تھا، لکھتا ہے کہ خیال کی منجنیق بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی، چتوڑ کے پہاڑی قلعہ کا دور آٹھ میل کا تھا، آسام کے قلعوں میں

Marfat.com

سری گھاٹ، ناندد اور سملا گڑھ کا ذکر کرتے وقت عالمگیر نامہ کا مصنفؒ بے حد متحیر ہو گیا تھا، ان سب قلعوں کو فوجی امرار نے اپنی پامردی اور جانبازی سے فتح کیا، اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی قلعہ ایسا رہ گیا تھا، جس کو انھوں نے تسخیر نہ کیا ہو، اسی طرح میدان کی لڑائیوں میں اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی، ظفر خاں، الپ خان، ملک کافور، خان عالم، منعم خان خانخانان، عبدالرحیم خان خانان، خان زمان، بہادر خان، ابراہیم خاں اسید عبدالوہاب، ذوالفقار خان، امیرالامرا سید حسین خان، اور قطب الملک سید عبداللہ خاں وغیرہ جس جوش خروش، شجاعت اور تہور سے لڑتے رہے، ان پر آج بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ اپنی سپاہیانہ خدمات کا صلہ حاصل کرنے کے لیے دربار کے اندر جس اخلاق و کردار کا نمونہ پیش کرتے رہے، وہ بہت زیادہ قابلِ تعریف نہیں، اور ان فوجی قائدین میں سے کسی میں بھی حضرت خالد بنؓ ولید، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بنؓ وقاص، اور حضرت سعید بنؓ عامر کا ہلکا پرتو بھی نہیں پایا جاتا ہے، ایسا کیوں تھا؟ کیا وہ صرف حصولِ جاہ و منصب کے حرص سے مغلوب رہے، اور کیا ان میں مذہبی غیرت و حمیت نہیں رہی؟ سلاطین وقت جنگ کے موقع پر برابر ان کا مذہبی جذبہ ابھارتے رہے، شہاب الدین غوری دوسری بار پرتھوی راج سے لڑنے کے لیے آیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام اور ہندو مذہب کی جنگ ہے، دکن میں جب جب فوجی امرار اپنی فوجیں لیکر گئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاد کرنے جا رہے ہیں، کنواہہ کی جنگ شروع ہونے سے پہلے بابر نے اپنے فوجی امرار کے سامنے جو تقریر کی اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مجاہدوں ہی سے مخاطب تھا، اس نے کہا کہ ہم قیامت کے دن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا موقع دیا ہے، کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے تو غازی کہلائے اور مرے تو شہید ہوئے، دونوں حال میں ہم کو بڑا درجہ اور بلند مرتبہ ملتا ہے، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ تمام سرداروں نے کلام پاک کو ہاتھوں میں لیکر قسمیں کھائیں کہ میدان جنگ سے کسی حال میں بھی منہ نہ موڑین گے، اورنگ زیب دارا سے اپنے امراء کے ساتھ یہ کہکر سموگڈھ کی طرف روانہ ہوا کہ وہ شرعی اور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، اور امراء اس سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ ہو گئے،

ان امراء کے مذہبی جذبات کو علماء بھی دین کی خدمت کے لیے ابھارتے رہتے تو شاید وہ مجموعی حیثیت سے اتنے بُرے نہ ہوتے جتنے کہ تاریخ کے صفحات پر دکھائی دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی امارت اور جاہ پسندی کی وجہ سے ان میں برائیاں پیدا ہوتی رہیں، پھر بھی وہ ایک بڑی قوت تھی، اسی لیے اچھے سلاطین انکی برائیوں کو نظرانداز کر کے ان کے اچھے اوصاف سے برابر فائدہ اٹھاتے اور ان کو بڑی سے بڑی طاقت کے خلاف ٹکراتے رہے، علماء ان کی برائیوں کے نکتہ چین تو ضرور تھے، لیکن ان کے عیش و عشرت کے قلعوں اور غفلت و بے عملی بلکہ دینی بے راہ روی کے حصاروں پر حملہ آور نہیں ہوئے، اور صرف وعظ و تلقین اور پند و نصائح کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش پر اکتفا کیا، اچھے سلاطین کی طرح ان کی قوت سے فائدہ نہیں اٹھایا، ان میں کوئی امیر مسجد بنا دیتا، مدرسہ قائم کر دیتا، بیواؤں اور مسکینوں کو خیرات دیکر فیاضی کا ثبوت دیتا، عالموں کو اپنے دربار میں رکھ لیتا تو اسی کو غنیمت جانتے اور کبھی اجتماعی طور پر ان کی مذہبی

Marfat.com

غیرت وحمیت کو دین کے فروغ اور اسلام کی صحت مندانہ ترقی میں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمات سے قطع نظر کرلیا جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے دور عروج میں علماء نے قائدانہ صلاحیت اور زعیمانہ قوت ونفوذ کا ثبوت نہیں دیا، اس لیے سلاطین کے بعد امراء ہی معاشرت کے قائد بنے رہے، اور چونکہ ان کی مذہبی حمیت صحیح طور پر ابھاری نہیں گئی، اس لئے ان کی امارت ان کی مذہبیت پر غالب ہوتی چلی گئی، اور اسی امارت کی خاطر ان میں باہمی بڑی کشمکش رہی، جس سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے، سلاطین دہلی کے عہد میں مملوک اور غیر مملوک، خلجی اور غیر خلجی، قرونہ ترک اور غیر قرونہ ترک، لودی اور غیر لودی امراء آپس میں لڑ لڑ کر خونریزی کرتے رہے، مغلوں کے عہد میں افغان اور غیر افغان، ایرانی اور غیر ایرانی، ہندوستانی اور غیر ہندوستانی، اور راجپوت اور غیر راجپوت امراء لڑے، اور امراء کا با اقتدار گروہ جس کا ساتھ دیدیتا وہی تخت وتاج کا مالک ہوجاتا، طاقتور حکمراں کے عہد میں امراء کی یہ آویزش دبی رہتی لیکن کمزور حکمرانوں کے آجانے سے پھر ابھر جاتی، ان کی اس آویزش سے مسلمانوں کی تاریخ کو بڑا نقصان پہنچا،

شیعہ سنی امراء کا تنازعہ، مغلوں کے آخری دور میں شیعہ اور سنی امراء کے جھگڑے بھی تکلیف دہ رہے، لیکن شیعہ اور سنی علماء ان جھگڑوں کو جس رنگ میں اب تک پیش کر رہے ہیں، اس سے ایک مورخ متفق نہیں ہوسکتا، یہ صحیح ہے کہ قطب الملک سید عبداللہ اور امیر الامراء سید حسین علی خان برہان الملک اور صفدر جنگ کی سرگرمیوں سے مغل حکومت کو نقصان پہنچا، لیکن اس کو بھی فراموش نہیں کیا

Marfat.com

جا سکتا کہ بیرم خان خان خانان، امیر الامرا شریف خاں، منعم خاں خانخان،
عبد الرحیم خانخانان، اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، یمین الدولہ
آصف خاں ابو الحسن مشہور بہ آصف جاہی، جملۃ الملک اسد خاں، شائستہ خاں اور
میر جملہ وغیرہ کی جان بازی اور شمشیر زنی سے مغلوں کی حکومت کو غیر معمولی سربلندی
بھی حاصل ہوئی، یہ صحیح ہے کہ سادات بارہہ نے فرخ سیر، رفیع الدرجات اور
رفیع الدولہ کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا، لیکن ان ہی کے بعد احمد شاہ کی
آنکھیں نکلوائی گئیں، عماد الملک کے ذریعہ عالمگیر ثانی کا قتل ہوا، اور ایک سنی
امیر غلام قادر روہیلہ نے قلعہ معلیٰ کے اندر داخل ہو کر نازنینان حرم کے پھول
سے رخساروں کو طمانچوں سے سرخ کیا، نوک خنجر سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں،
یہ پہلو بڑا ہی دردناک ہے کہ بنگال میں میر جعفر اور دکن میں میر صادق پیدا ہوئے
لیکن حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ بریلوی کی اسلامی تحریک کو
بالاکوٹ میں دفن کرنے والے آخر کون تھے؟ اس کا جواب موجودہ دور کے ایک
دیدہ ور عالم اور مورخ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ان مجاہدوں کی تاریخ بتائے گی
کہ ان کی تحریک کا یہ انجام کیوں ہوا، واقعہ چھپا اور اسباب نامعلوم نہیں، وہی
جماعتوں کا نفاق اور امراء کا اختلاف ان کی ناکامی کا سبب ہوا، جو ہمیشہ سے ناکاموں
کی ناکامی کا سبب بنا رہا ہے، پشاور کے پٹھان امرا اگر وفاداری سے کام لیتے تو
آج ہندوستان کا نقشہ دوسرا ہوتا،

شیعہ امرا سنی امرا ہی کی طرح اپنے اقتدار کی خاطر تخت و تاج سے الجھتے
رہے، ان کی بادشاہ گری سنی امرا ہی کی طرح تھی، مملوک امرا نے بادشاہ گر

Marfat.com

گر بن کر التتمش کو تخت پر بٹھایا، خلجی امرا نے جلال الدین خلجی کے سر پر تاج رکھا، فروعہ ترک امرا نے غیاث الدین تغلق کو اپنا بادشاہ بنایا، لودی امرا نے خاندان سادات کو ختم کرکے بہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کیا، مغلوں کے دور میں جنگ جانشینی کی لڑائی امرا ہی کے سہارے لڑی جاتی تھی، اسی طرح آخری دور میں سادات بارہہ بادشاہ گر ہو گئے تھے تو یہ محض ان کی اقتدار پسندی تھی، لیکن اس اقتدار پسندی میں بھی تیموری خاندان کے احترام میں سنی بادشاہ ہی کو تخت پر بٹھاتے رہے، اور انھوں نے ان بادشاہوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا، وہ محض ان کی سیاسی بازی گری تھی، اس کا تعلق ان کے مذہبی عقائد سے جوڑنا صحیح اور مورخانہ تجزیہ نہیں ہوگا، قطب الملک سید عبداللہ خان اور امیر الامرا سید حسین علی خان کے متعلق مآثر الامرا کے مصنّف کا بیان ہے کہ

"ایشاں از اعاظم سادات بارہہ اند، واکابر شرفائے ہند۔ ہر دو برادر فرقدین فلک سیادت دنیرین سپہر امارت بودند، متحلّی باکثر شمائل سنیہ، وخصائل رضیہ خصوص سخاوت وشجاعت کہ ازین دو صفت دالا آثار عزا ربظہور رسانند و نقشہائے کہ طراز صفحہ دولت باشد بر لوح روزگار نشانند و از مبادی ایام عروج تا منتہی بخوبی ونیکنامی بسر بردند، و از آبیاری عدل و احسان عرصۂ ہندرا رشک فردوس برین بردند، لیکن در اواخر ایام دولت راہ غلط پیمودند وتا روز قیامت داغ بدنامی باخود بردند"

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سادات بارہہ اور ان کے ہم خیال امرا کی سرگرمیوں کو مبالغہ آمیز طریقہ پر بیان کرکے مسلمانوں میں خواہ مخواہ مذہبی اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی

Marfat.com

کوشش کرتا ہے، لیکن ہندوستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہو سکتے، غوریوں نے پنجاب میں غزنویوں کو ختم کیا، تیموریوں نے دہلی میں آکر خاندان تغلق کی حکومت پر ایک زبردست ضرب لگائی، سکندر لودی نے شرقی خاندان کو ختم کیا، بابر نے ابراہیم لودی کو پانی پت کی جنگ میں شکست دیکر بے شمار مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر کر دیا، شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ہندوستان چھوڑ کر جلاوطن ہونے پر مجبور کیا، اکبر مظفر گجراتی اور چاند سلطانہ کے خلاف برابر یلغار کرتا رہا، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی آکر جو خونریزی کی، اس کی تفصیل پڑھکر اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان میں فریقین سنی ہی تھے، اگر ان میں کوئی فریق شیعہ ہوتا تو سنی شیعہ کا سوال پیدا ہو جاتا، جیسا کہ عالمگیر کے زمانے میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی فوج کشی کو بنا دیا گیا ہے، اور اورنگزیب کے تمام ننھیالی رشتہ دار شیعہ تھے، اس کی بیوی دلرس بانو کے تمام اعزہ واقربا بھی شیعہ ہی تھے، وہ دربار اور محل کے اندر زیادہ تر شیعی عقائد رکھنے والوں ہی سے گھرا رہتا تھا، اگر ان سب کو وہ محض شیعہ ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا تو شاید اس کا ایک لمحہ بھی سکون و چین سے نہیں گذر سکتا تھا، سنیوں اور شیعوں میں مذہبی عقائد کے سلسلہ میں جو اختلافات اور لڑائیاں ہوئیں وہ اسلامی تاریخ کا بہت ہی المناک پہلو ہے، اس سے اسلام کو بڑا نقصان پہنچا، لیکن ان کی نوعیت شیعہ اور سنی امرار کے جھگڑوں سے بالکل الگ ہے، امرار کی آویزش کا مقصد اقتدار، جاہ اور منصب کے علاوہ کچھ اور نہ تھا،

مسلمان عوام | علمار ان جھگڑوں کو بے بسی سے دیکھتے رہتے، حالانکہ وہ سلاطین

اور امرار کو چھوڑ کر عوام کے دلوں کو تسخیر کرتے، تو سلاطین اور امرار دونوں کو اپنے سامنے جھکا سکتے تھے، اور مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کا اعلیٰ اور اونچا طبقہ ہر زمانہ میں اچھا نہیں رہا، بلکہ بعض زمانے میں بہت برا ہو گیا، جس سے ان کی تاریخ ہی بدل گئی، لیکن مسلمان عوام ہر زمانے میں اچھے رہتے ہیں، ان کا ظرف توحید و رسالت کی اعلیٰ تعلیم اور اسلام کی برتری کے احساس کی بدولت ہمیشہ سونے کا رہتا ہے، جس پر زمانہ کبھی زنگ لگا دیتا ہے، لیکن جب کبھی اچھے سنار کے ہاتھوں میں آجاتا ہے تو پھر کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے، اسی لیے یہی عوام لشکری بن کر اچھے سلاطین اور اچھے امرار کی قیادت میں بڑے بڑے جنگی اور حربی کارنامے انجام دیتے رہے، کبھی کوچی رن کے ہلاکت خیز صحرا میں پہنچے، کبھی ارکان کے دشوار گذار علاقوں میں داخل ہو کر دریائی جنگلوں سے گذرے، کبھی وندھیاچل کے پُرپیچ اور تنگ راستوں کو طے کیا، کبھی تبت و ترکستان کی سرحد تک پہنچ کر اپنی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے، کبھی قراجیل کے ہولناک دروں میں موت اور ہلاکت سے سینہ سپر ہوئے، کبھی ان کا دل بادل دریائے سرخاب اور کوہ ہندوکش کے برفستانی علاقوں سے گذرا، اور ان ہی کی نبرد آزمائی اور سپہگری سے نہ صرف کشمیر سے راس کماری تک ہندوستان کو جغرافیائی وحدت حاصل ہوئی، بلکہ ان کی وجہ سے ہندوستان کا پرچم کابل، قندھار، بست، بلخ اور بدخشان پر بھی لہرایا، ان جنگی کارناموں پر کسی قوم کو بھی ناز اور فخر ہو سکتا ہے،

پھر یہی مسلمان اپنے سلاطین کے جامد مقلد بھی نہیں رہے، اچھے علمار کی قیادت میں کیا کچھ نہیں کیا، علمار ہی کے اثر سے اکبر جیسا وسیع المشرب اور

Marfat.com

روادار حکمراں اُن میں مقبول نہ ہوسکا، انھوں نے حضرت احمد سرہندیؒ کو مجدد وقت تسلیم کرکے اپنا سرتاج بنایا، تو جہانگیر جیسے تاجدار کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑا، محمد شاہ رنگیلے کے جانشیں احمد شاہ اور اس کی ماں کو اندھا کیا گیا، تو وہ خوش تھے، آگے چل کر تیموری خاندان کے فرمانرواکو نظر انداز کرکے وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت اسمٰعیل شہید کے پیچھے جسطرح اٹھے، اس پر ان کی نسلوں کو آج بھی فخر ہے،

عالمگیر کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے عہد میں مسلمانوں پر سخت وقت آیا، تو وہ التمش کی دیندارانہ اولوالعزمی، بلبن کی فرنگیخسروی، علاءالدین خلجی، کے عہد کی اقتصادی خوشحالی اور رعیت پروری، محمد تغلق کی فیاضی اور عدل گستری فیروز تغلق کی شریعت نوازی، بابر کا سپاہیانہ جوش و خروش اور آہنی عزم، ہمایوں کا استقلال و ہمت، شاہجہاں کی شان و شوکت اور عالمگیر کی نبرد آزمائی اور بیدار مغزی پھر سے دیکھنا چاہتے تھے جو میسر نہ ہوئی، اس کے بجائے انھوں نے جہاندار شاہ کی طوائف لال کنور کی رنگ رلیاں دیکھیں، جو اپنی تمام بدعنوانیوں کے ساتھ جہاندار شاہ کی جگہ حکومت کرنے لگی تھی، اور جس کو چاہتی اعزاز و منصب عطا کرتی اور دربار اور حرم کی اس اخلاقی پستی کو دیکھ کر مسلمان خون کے آنسو روتے رہے، مسلمانوں میں اس وقت تک اجتماعی اور تنظیمی شعور پیدا نہیں ہوا تھا، ان کی قوت یا سلاطین تھے، یا امراء جب ان دونوں سے اس کو مدد نہ ملتی تو علماء کی طرف نظر اٹھاتے، اکبر کے زمانہ کی بے راہ روی کو جہانگیری عہد میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس طرح

Marfat.com

رد کا تھا، اُس سے لذت آشنا ہونے کے بعد ہر زمانے میں بادشاہ وقت کی کج روی کے سدباب کے لیے علما رہی کی طرف ان کی نظر اٹھتی تھی، لیکن عالمگیر کے بعد سلاطین کی بے راہ روی کو روکنے میں علما، کی طرف سے کوئی صحیح رہنمائی نہیں ہوئی اور جہاندار شاہ پر وہ مطلق اثر انداز نہ ہو سکے، فرخ سیر کی وفات کے بعد اجیت سنگھ راٹھور اپنی لڑکی کو شاہی محل سے جودھپور لے جانے لگا تو یہ راجپوت شاہزادی اپنا اسلامی لباس اتارتی گئی، یعنی اسلام ترک کرکے ہندو بن کر باپ کے گھر گئی، خافی خاں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں اس سے بڑی ہلچل پیدا ہوئی کہ ایک مسلمان عورت پھر ہندو ہو جائے، یہ بات شریعت اسلام اور ناموس سلطنت کے خلاف سمجھی گئی، کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ راجاؤں کی لڑکیاں مشرف بہ اسلام ہو کر بادشاہ کی زوجیت میں رہنے کے بعد پھر ہندو بن کر اپنے گھر کو جائیں، علما رنے اس موقع پر احتجاج تو کیا لیکن وہ موثر نہ بن سکے اور اس عہد کے بادشاہ گر قطب الملک سید عبداللہ خاں نے راجپوت شاہزادی کو محل سے جانے کی اجازت دیدی اور ایک کرور روپیے کا مجوزہ سامان بھی اس کے ساتھ واپس کر دیا،

محمد شاہ کے لڑکے احمد شاہ کے عہد میں تو حکومت کا نقشہ اور بھی بدل گیا، اس کی ماں اودھم بائی ایک نو مسلم طوائف تھی، وہ اودھم بائی سے نواب قدسیہ صاحب زمانی حضرت قبلۂ عالم ہوگئی اور پنج لاکھ سوار کے منصب سے سرفراز کی گئی، اسی کی ڈیوڑھی میں دربار لگتا، اور سلطنت کے تمام اہم کام انجام پاتے، اس کا بھائی مان خان ادنیٰ درجہ کا گویا اور رنجنیا تھا، لیکن شش ہزاری منصب دار بنا کر معتقد الدولہ بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، پھر محل کا ایک خواجہ سرا جاوید خان

وزارت عظمیٰ پر فائز کیا گیا، اور اس کو نواب بہادر کے خطاب پانے کے ساتھ ہی مراتب علم اور نقارہ کے استعمال کی بھی اجازت دی گئی، اس پر علماء کی غیرت رحمت ابھری تو احمد شاہ کی معزدلی کا فتویٰ صادر کیا، اور محمد شاہ محبوس کر دیا گیا، پھر اس کی اور اس کی شوخ دیدہ ماں دونوں کی آنکھیں نکلوا دی گئیں، عام مسلمان اس سے آزردہ خاطر ہونے کے بجائے خوش ہوئے، لیکن مسلمانوں کی حکومت کی گرتی ہوئی عمارت صرف فتویٰ کے سہارے نہیں رک سکتی تھی، مسلمان سلاطین قطب مینار، لال قلعہ اور تاج محل بنا کر مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی کا رعب و جلال دکھا چکے تھے، اس لیے ضرورت اس کی تھی کہ علماء و صلحاء اپنے دل بے تاب اور نگاہ مرد مومن سے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کے قطب مینار اور تاج محل بنا کر ان کی تقدیر بدل دیتے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور جب اس کی کوشش کی تو اس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی، جس وقت جانباز، سرفروش اور کفن بردوش علماء کے پیدا ہونے کی ضرورت تھی، اس وقت اُن کا فقدان ہو گیا تھا،

لایق سلاطین کے عہد میں لایق علماء اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اچھے سلاطین ہی کے عہد میں اچھے علماء بکثرت پیدا ہوتے رہے، اور نالایق سلاطین کے دور میں اچھے علماء پیدا نہ ہو سکے، ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں اس قدر ارباب فضل و کمال جمع ہو گئے تھے، کہ ربع مسکون میں اس کی کوئی مثال نہ تھی، اور اس کا دربار محمود و سنجر کا دربار معلوم ہوتا تھا، بلبن کے عہد میں مولانا برہان الدین محمود بلخی، مولانا نجم الدین، عبد العزیز دمشقی، مولانا شیخ سراج الدین سنجری، مولانا شرف الدین دلوالجی، قاضی رکن سامانوی، مولانا کمال الدین زاہد، مولانا شمس الدین خوارمی، مولانا فخر الدین ناقلہ، قاضی رفیع الدین،

Marfat.com

گازرونی، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی ظہیر الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین، مولانا سید منتخب الدین، مولانا سید معین الدین سامانہ کے علم و فضل سے اس عہد میں فیوض و برکات کا بڑا چشمہ بہتا رہا،

علاء الدین خلجی کا شمار دیندار اور متقی سلاطین میں نہیں کیا جاتا ہے، لیکن وہ ایک لائق اور کامیاب حکمران ضرور تھا، اور اس کی حکومت میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوتی رہی، اور اسی کے ساتھ اس کے عہد میں علماء بکثرت جمع ہوگئے تھے، ضیاء الدین برنی نے قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی مشرف سرباہی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، مولانا رکن الدین سنامی، مولانا تاج کلاہی، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین ملتانی، وغیرہ جیسے چھیالیس علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ اگر ان میں سے ہر ایک کے علمی کمالات کا ذکر کیا جائے تو ایک ایک کتاب تیار ہوجائے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ ان میں سے بعض علماء امام غزالی، امام رازی، امام ابو یوسف اور امام محمد کے پایہ کے تھے، سلطان محمد تغلق کے دور میں، مولانا ضیاء الدین بخشی، مولانا معین الدین عمرانی، مولانا عفیف الدین کاشانی، مولانا ناصر الدین واعظ ترمذی، مولانا عبد العزیز اردبیلی، شیخ ابوبکر بن خلال وغیرہ جیسے علماء سے خواص و عوام فائدہ اٹھاتے رہے، یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ذو سو فقہا اس کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے،

فیروز شاہی عہد میں مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کرمانی، مولانا جلال الدین، مولانا علیم الدین، مولانا خواجگی تھانیسری، قاضی عبد المقتدر شریحی، مولانا عالم بن علاء

(مؤلف فتاویٰ تاتار خانیہ) مولانا شرف الدین محمد العطائی (صاحبِ فوائد فیروز شاہی)
جیسے علماء موجود تھے، ان میں سے بعض علماء سے خود فیروز شاہ استفادہ کرتا رہا،
سلطان سکندر لودی کے عہد میں مولانا شیخ سعد اللہ، مولانا شیخ رزق مشتاقی،
مولانا الہ داد، مولانا شیخ عبد الوہاب بخاری، مولانا شاہ جلال تبریزی، مولانا شیخ عبد اللہ
تلنبی، مولانا میاں طٰہٰ، مولانا میاں خواجگی، مولانا سید رفیع الدین صفوی، مولانا جلال الدین
دوانی، مولانا شیخ حسام الدین المعروف بہ اجھر، مولانا میاں بھوہ، ممتاز علماء تھے، جو محراب
ومنبر اور مسند درس وتدریس کی زینت بنکر عوام وخواص کو اپنے علم وفضل سے سیراب کرتے رہے، عہد اکبری میں ابوالفضل
نے شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن، امن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبد العزیز،
شیخ الہدیہ، شیخ عبد الغفور کو خدا شناسان کہا ہے، امیر فتح اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشکندی،
مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین، حکیم مصری، اور مولانا صادق کو دانندۂ معقول ومنقول
لکھا ہے، مولانا پیر محمد، مولانا عبد الباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نور الدین ترخان کو
شناسائے عقلی کلام بتایا ہے، اور میاں حاتم، مولانا عبد القادر، مخدوم الملک،
میر عبد اللطیف، میر نور اللہ، شیخ عبد النبی، وغیرہ کو خوانان نقلی، مقال کہا ہے، ان کے
علاوہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری
شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤدی جھنی وغیرہ کے فیوض وبرکات سے عوام
وخواص متمتع ہوتے رہے،

جہانگیر نے اپنے عہد میں میران صدر جہانی، مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی، مولانا نقیب
شوستری، مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی کو ہر طرح نوازا، اور اس عہد میں اور جو دوسرے
علماء تھے ان کے نام ملا روزبہان شیرازی، اعمی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر بھٹی

Marfat.com

ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نور اللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبد اللطیف سہارنپوری، ملا عبد الرحمٰن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری اور ملا محمد جونپوری تھے،

شاہجہانی عہد میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل بدخشانی، قاضی محمد اسلم ہروی، قاضی محمد سعید کرہ ہروی، ملا میرک شیخ ہروی، ملا عبد اللطیف سلطانپوری میر محمد ہاشم گیلانی، ملا فرید دہلوی، ملا یوسف، ملا عبد السلام لاہوری، مولانا محب علی مولانا سید محمد رضوی، ملا محمود جونپوری وغیرہ اسلام کی عزت وناموس کے محافظ رہے، عالمگیر نے مولانا عبد اللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعد اللہ ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون شیخ عبد القوی ملا شفیعائے دانشمند خاں جیسے علماء سے تعلیم پائی، پھر فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب وتدوین میں شیخ نظام برہانپوری، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہہ الدین گوپاموی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری جیسے علماء اور فقہاء نے پوری اعانت کی، پھر اسی عہد میں ملا محمد یعقوب، شیخ سلیمان منیری ملا قطب ہانسوی، ملا عبد اللہ سیالکوٹی، شیخ قطب برہانپوری، ملا عوض وجیہ قاضی عبد الوہاب، مولانا سید محمد بیجاپوری، حاجی احمد سعید بہاری، سید علی اکبر سعد اللہ خانی، ملا محمد اکرم لاہوری، حافظ ابراہیم، ملا شرف الدین لاہوری، ملا عبد الباقی، جونپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، قاضی ملک محب اللہ بہاری، سید سعد اللہ سلونی وغیرہ اپنے علم وفضل، ذہانت وذکاوت اور فطرتِ عالی کی وجہ سے عزت ووقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے،

Marfat.com

اچھے علمار کا نقدان | عالمگیر کے بعد نالایق حکمرانوں کی ایک طویل فہرست ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس زوال اور ادبار کے زمانے میں شاہ ولی اللہ کے عہد شباب تک اچھے علمار اور صلحار کا نقدان ہوگیا، شاہ ولی اللہ کی ولادت ۱۷۰۳ء میں ہوئی ۱۷۱۹ء میں اپنے والد بزرگوار کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے، بارہ برس تک درس وتدریس دیتے رہے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث کی تحصیل وتکمیل کرکے دو سال کے بعد واپس ہوئے، تو انھوں نے تجدید واصلاح کا کام شروع کیا، اس اثنار میں جانشینی کی سات لڑائیوں سے تخت وتاج کی بنیاد ہل گئی تھی، ان لڑائیوں میں بڑے بڑے جانباز، آزمودہ کار اور لایق فوجی سردار مارے گئے، اور جو مارے نہیں گئے وہ دربار سے منسلک ہونے کے بعد میدان جنگ کی کدورت دیوان عام اور دیوان خاص میں بیٹھ کر نکالتے رہے، جس سے دربار سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گیا، اور جہاندار شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک دربار کی تاریخ نفاق پرور ریشہ دوانیوں اور ہلاکت خیز فتنہ انگیزیوں سے معمور رہی، اور جب حکومت شام غریباں بن کر رہ گئی تو مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور بڑھی، سکھوں نے پنجاب میں اپنا تسلط قائم کر لیا، جاٹوں اور انگریزوں نے بھی حکومت کی بازی لگائی، اس طوائف الملوکی میں اچھے علمار کی پیداوار بھی بند ہوگئی، درس وتدریس کی مسند تو خالی نہیں ہوئی محراب ومنبر کی زینت بھی نہیں گئی، لیکن ان علمار سے مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا، شاہ ولی اللہ اپنے عہد کے علمار کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے دکھ اور درد سے فرماتے ہیں،

"اے بدعقلو! جنھوں نے اپنا نام علمار رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے

Marfat.com

علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف، نحو اور معانی میں غرق ہو، اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے، یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے، یا سنت ثابتہ قائمہ کا، چاہیئے کہ قرآن سیکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری، روش کی پیروی، اور آپ کی سنت پر عمل کرو، تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرایا ہے کہ علمار کی بڑی کثرت ہوچکی ہے، حالانکہ ابھی کتنے بڑے بڑے علاقے ہیں جو علمار سے خالی ہیں، اور جہاں علمار پائے بھی جاتے ہیں وہاں بھی دینی شعار کو غلبہ حاصل نہیں ہے، دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں کہ تمھارا کیا حال ہے، ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس پر تمھارا ایمان ہے، لوگوں کو تم جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو، اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے، نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کرو گے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اسی طرح سلاطین کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روتے ہیں، اور وہ ایک خط میں گذشتہ زمانہ کو یاد کرکے لکھتے ہیں، کہ بادشاہان اسلام کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک زبردست نعمت ہے، قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جد و جہد کے بعد اس ولایت کو فتح کیا، دہلی کے علاوہ جو صاحب اقتدار بادشاہوں کا مستقر رہی ہے، ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروا تھے، گجرات، ٹھٹھ، بنگالہ، برہانپور، برار، اورنگ آباد، حیدرآباد، بیجاپور، مالوہ میں صاحب فوج اور صاحب خزانہ بادشاہ ہوتا تھا، ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی

Marfat.com

مملکت میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کئے، عرب و عجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہوکر ان علاقوں میں آگئے، اور یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کا سبب بنے، اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور و طریقے پر قائم رہی لیکن آگے چل کر اپنے زمانے کے سلاطین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی ناعاقبت اندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی وجہ سے طوائف الملوکی شروع ہوگئی، مرہٹوں اور جاٹوں کو غلبہ حاصل ہوگیا، بادشاہوں کی نااہلی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بیت المال کا صحیح انتظام نہیں کرتے اور خزانہ کی قلت کے باوجود ایسے لوگوں کو وظائف دیتے ہیں جو محنت نہیں کرتے، لیکن وظایف پاکر خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، خزانے کو بھرنے کے لیے کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری بھاری محصول لگایا جاتا ہے، پھر بھی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی، جاگیرداروں کی کثرت ہوگئی ہے، اور ان کے مسموم اثرات معاشرت میں پھیلے ہوئے ہیں،

امراء کی جو اخلاقی حالت بگڑ گئی تھی، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، شاہ ولی اللہؒ کو اس کا رنج تھا کہ وہ دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوب کر اپنا سارا وقار کھو چکے ہیں بلکہ ان کو اس کا بھی دکھ تھا کہ بنگال اور اودھ میں انھوں نے اپنی اپنی سلطنت قائم کرکے دہلی کی مرکزیت کو ختم کر دیا ہے،

بگڑی معاشرت اور جب اچھے سلاطین، اچھے امراء اور اچھے علماء نہیں رہے جو حکومت اور معاشرت کو سنوارنے والے تھے، تو عام مسلمانوں کی بھی معاشرت بگڑی شاہ ولی اللہؒ ان پر آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے اخلاق خراب ہوچکے ہیں ان پر حرص و آز سوار ہوگیا ہے، ان پر شیطان نے قابو پالیا ہے، انھوں نے حرام کو

حلال اور حلال کو حرام بنا دیا ہے، روزی کمانے کے بجائے، دوسروں کے سینوں کے بوجھ بنے ہوئے ہیں، دنیا کمانے اور دھندوں میں اتنے پھنس گئے ہیں کہ نماز روزہ، اور زکوٰۃ کا مطلق خیال نہیں کرتے، انھوں نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لیے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بھی بگڑ گئی ہے، اور انکی زندگی بھی، ان کے لیے تنگ ہو گئی ہے مسلمانوں میں جو پیشہ ور ہیں ان میں امانت کا جذبہ بالکل مفقود ہو گیا ہے، وہ فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہیں، مدار اور سالار کا حج کرتے ہیں، ان میں سے بعض لوگوں نے فال بازی گنڈے اور ٹوٹکے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ

شاہ ولی اللہؒ کا احسان

اس سقوط و تنزل کے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے انحطاط کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد قلمی جہاد کیا اور قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ اور اس کے تشریحی فوائد لکھکر عام مسلمانوں کے ذہن کو اس کی تعلیمات سے قریب تر کیا، اسی طرح حدیث کی اہم ترین کتاب مؤطا کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی اور مدارس میں فقہ و منطق کے بجائے حدیث کے درس و تدریس پر زور دیا، جس کو ان کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیلایا، تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کی اہمیت بتا کر فقہی جمود کو توڑا، اور حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اسی طرح ازالۃ الخفا لکھکر شیعوں اور سنیوں کا ذہن صاف کیا، تفہیمات میں اصلاح معاشرت اور اصلاح رسوم پر زور دیا، اور حجۃ اللہ البالغہ تو آج تک علماء کے لیے شمع ہدایت ہے اور بقول مولانا شبلی اس کی نکتہ سنجیوں کے آگے، غزالی، رازی اور ابن رشد کے

Marfat.com

کارنامے بھی ماند پڑ گئے، اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس دینا شروع کیا، تو اس کے طلبہ یہاں کے اصلاحی نصاب کو سندھ سے بنگال تک سیکڑوں مدارس میں رواج دیتے رہے، جس سے اسلام کی ایک نئی لہر ہندوستان میں پھیلی، اس موقع پر اس کا اظہار غیر مناسب نہ ہوگا کہ اس مدرسہ کے لیے ایک عالی شان مکان محمد شاہ رنگیلے نے عطا کیا تھا، موجودہ دور کے ایک بڑے عالم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس رنگیلے نے مسلمانوں کے ساتھ وہ رنگین سلوک کیا کہ اگر مسلمان اس غریب کو اس خدمت کی بنیاد پر بخش دیں تو وہ اس کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے،

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دردمند دل کی سیاسی پکار ان کے ان خطوط میں سنائی دیتی ہے، جو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے علاوہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو لکھے، ان امرا میں اسلامی حمیت اور غیرت باقی رہ گئی تھی، اس سے شاہ صاحب نے فائدہ اٹھانا چاہا، نجیب الدولہ کو وہ رئیس المجاہدین، امیر الغزات اور منبع الحسنات کے لقب سے یاد کرتے رہے، اور نجیب الدولہ کی تائید سے احمد شاہ ابدالی کو مدعو کیا، اس دعوت پر احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں ہندوستان آیا اور پانی پت کی مشہور تیسری لڑائی ہوئی، اس کا نتیجہ اتنا تو ضرور ہوا کہ مغل بادشاہوں کی حکومت کی مدت کچھ اور بڑھ گئی، لیکن ان کی بنیادی کمزوریوں میں کوئی مضبوطی پیدا نہ ہوسکی، کیونکہ ان میں ان کے اسلاف کی طرح شاہین کا جگر اور عقابی قوتِ پرواز باقی نہ رہ گئی تھی، ان کی تلوار صیقل زدہ اور برندہ ہونے کے بجائے کند ہو چکی تھی، اور ان میں بہادری لے لہو ترنگ کے بجائے صرف نااہلی کا جل ترنگ رہ گیا تھا،

حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت اورنگزیب کے آخری زمانے میں ہوئی، اور

Marfat.com

بہادر شاہ اول سے لیکر شاہ عالم تک کا زمانہ دیکھا، ان میں جہاندار شاہ اور احمد شاہ کی زندگی تو رنگینی اور بدمستی میں گذری، عالمگیر ثانی ایک مذہبی حکمران تھا، غیر مسلم مورخوں کا بیان ہے کہ وہ عالمگیر اول کا مقلد بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا، اور اس نے اپنے وزیر عماد الملک کی مدد سے بہت سی بدعتوں کو روک کر مذہب کو بھی فروغ دینا چاہا، شاہ عالم میں بھی دینداری تھی، وہ تو خواجہ میر درد کی محلس سماع میں ذوق شوق سے شریک ہوتا تھا، اکبر ثانی کے تعلقات حضرت شاہ ولی اللہ کے گھر والوں سے بہت اچھے تھے، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جامع مسجد دہلی میں رسول اللہ صلعم کے کچھ تبرکات رکھے رہتے تھے، جن کو نکالتے وقت لوگ زور شور سے نعت پڑھتے تھے، اور ان کو شاہی محل زیارت کے لیے لیجاتے تھے، ایک روز شاہ اسمٰعیلؒ مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے کہ یہ تبرکات نکالے گئے لیکن انھوں نے انکا احترام نہیں کیا، لوگوں کو ناگوار ہوا، اور بادشاہ اکبر شاہ ثانی سے ان کی شکایت کی، بادشاہ نے ان کو بلوا کر واقعہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا یہ تبرکات مصنوعی ہیں، اور ان کی تعظیم ضروری نہیں، بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا یہ کیسے، شاہ صاحب نے جواب دیا کہ اسکو تو آپ بھی مصنوعی سمجھتے ہیں، اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ تبرکات آپ کی زیارت کیلئے آتی ہیں آپ کبھی انکی زیارت کیلئے تشریف نہیں لیجاتے، یہ سنکر بادشاہ چپ ہو گیا، پھر شاہ صاحب نے کلام مجید اور بخاری لانے کو کہا، اور ان کو ہاتھ میں لیکر واپس کر دیا، اس کے بعد بادشاہ سے فرمایا کہ کلام اللہ اور کلام رسول دونوں بڑے تبرکات ہیں، یہ دونوں چیزیں آپکے سامنے آئیں، لیکن آپ نے کوئی تعظیم نہ کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تبرکات کی تعظیم ان کے شرف کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ محض ایک رسم پرستی ہے، یہ سنکر بادشاہ

کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں سونے کے کڑے تھے، شاہ صاحب نے اس کو بھی حرام بتایا، بادشاہ نے فوراً اتار دیے، ایک شہزادہ بیٹھا ہوا تھا، اس کی داڑھی منڈی ہوئی تھی اس کو داڑھی رکھنے کی تلقین کی اور اس نے حکم کی تعمیل کی۔

بہادر شاہ ظفر میں بھی بڑی مذہبیت تھی، اس کی حمد و نعت میں جو کیفیت ہے اس سے اس کا پورا اندازہ ہوتا ہے، وہ بادشاہ کے لباس میں ایک صوفی منش درویش تھا، اس کو مولانا فخر الدین سے شرف بیعت بھی حاصل تھا، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔ تصوف میں اس کو اس قدر انہماک ہوگیا تھا کہ سعدی کی گلستاں کی شرح صوفیانہ نقطۂ نظر سے خود لکھی، اور اشغال و اذکار میں ایک کتاب سراج المعرفت لکھوائی، لیکن کسی حکمران کی مذہبیت اسی وقت موثر ہو سکتی ہے، جب اس میں صدیقیت فاروقیت اور اسد اللٰہیت کا پرتو ہو، یہ درجہ بہت بلند ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں شاید ہی کسی کو حاصل رہا ہو، اس لیے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہبیت کے ساتھ اگر بلبنیت، بابریت اور عالمگیریت بھی ہو تو وہ موثر ہو سکتی ہے، مغلوں کے آخری چند سلاطین مذہبی تو تھے، مگر ان میں مذہب کی اصلی روح نہ تھی، اور تاریخ کو مڑکر دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی اگرچہ سنگ دل تھا اور بظاہر مذہب سے بیگانہ وحشی کا الزام اس پر عائد کیا جاتا ہے، پھر بھی اس کا دور اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ اس کے زمانہ میں دہلی قبۃ الاسلام بن گئی تھی، اسی طرح بلا نوش اور پیالہ کش جہانگیر کا عہد حکومت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس دور میں حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے دین کا احیا رہوا،

Marfat.com

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مذہبیت سے ان کا ذاتی وقار تو کچھ ضرور قائم رہا، لیکن ان کی نااہلی کی وجہ سے ان کی حکومت سنبھل نہ سکی، اسی لیے اس زمانے میں علمار نے جو تحریک اٹھائی، اس میں انھوں نے خود بھی ان بادشاہوں کو نظرانداز کر دیا،

علمار کی دست گیری اور یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جب حکمران وقت ان کے لیے بیکار ہو گیے، تو علمار نے آگے بڑھ کر ان کی دست گیری کی، شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف سے جو ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کیا، اس کو ان کی اولادوں اور شاگردوں نے اپنی غیر معمولی سرگرمیوں سے برقرار رکھا،

شاہ عبدالعزیزؒ ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے تو اپنے زمانہ میں یہ فتویٰ دیدیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقتوں کے قبضے میں جا چکے ہیں، ان میں برائے نام سلطان کا دخل مانا بھی جاتا ہو تو وہ سب کے سب دارالحرب ہیں،

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عملی سرگرمیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ اب اس کا وقت نہیں رہا کہ علمار ارباب رخصت بن کر مدرسوں میں درس دیتے رہیں اور محراب ومنبر کی زینت بن کر صحیح عقائد کے اعلان پر قناعت کرلیں، بلکہ اس کا وقت آگیا ہے کہ ارباب عزیمت بن کر اسلام کی عزت وناموس کی پاسبانی کریں، مسلمان خواص وعوام دونوں کی بگڑی ہوئی معاشرت کو سنواریں، اور کانٹوں کی راہ پر چل کر سربکف اور کفن بردوش ہو جائیں،

انھوں نے تجدید و اصلاح کی خاطر پہلے بدعتوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی، مسجدوں، عرسوں اور مجلسوں میں جہاں مسلمان جمع ہو جاتے وعظ کہنے لگتے،

Marfat.com

اور ان کو توحید و تقویٰ کی طرف پکار پکار کر بلاتے، معصیت کے اڈوں پر بھی پہنچ کر اللہ کا پیام سناتے اور معصیت کی زندگی چھوڑ کر صالح زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے،

انھوں نے تقویت الایمان لکھ کر یہ بتایا کہ وہی زندگی تہذیب اور معاشرت اسلامی ہے جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو، اس کے علاوہ کوئی زندگی یا تہذیب یا معاشرت خواہ کیسے ہی شاندار اور دل آویز ہو، اسلامی نہیں کہی جا سکتی، اس کتاب کے متعلق موجودہ دور کے ایک بڑے عالم کی رائے ہے کہ اگر یہ کتاب پانچ سو سال پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتے لیکن پھر بھی اس کتاب نے مسلمانوں میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا،

حضرت سید احمد شہید بریلوی

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، جو ان سے عمر میں آٹھ سال چھوٹے تھے، اور ان کے چچا شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد اور مرید تھے، ان کی ذات میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے ایک سہ آتشہ تیار ہوا تھا، دونوں کی کوششوں سے تجدید دین کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی، جس کو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی تحریک سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور دونوں نے مل کر مسلمانوں کی ایک ایسی مخلص جماعت پیدا کی جو خدا اور نبی کی وفادار اور مئے حق کے نشہ میں سرشار ہو کر جہاد کے لیے آمادہ ہوگئی، لیکن ترائن، کنواہا اور پانی پت کے فاتحوں اور ارکان، بلخ اور

Marfat.com

قندھار پر پرچم لہرانے والوں کے جانشینوں سے اس کو کوئی مدد نہیں ملی، کیونکہ وہ مدد دینے کے لائق ہی نہیں رہ گئے تھے، اس جماعت کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور بالاکوٹ میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی دونوں شہید ہوئے، ان کی ناکامی کے اسباب پر اب تک تحقیقات جاری ہیں، لیکن جس طرح کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوا، اسی طرح اس تحریک کے کربلا کے بعد ہندوستان میں اسلام پھر سے زندہ ہوا، کیونکہ ان دونوں بزرگوں کے پیرووں نے ان کی تعلیمات کو پنجاب سے لیکر بنگال کی سرحد تک جاری رکھا، اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمانوں کی سلطنت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تو نہ بچا سکے، لیکن انھوں نے دین و مذہب اور ایمان و یقین کی ایک نئی روح پھونک کر ہندوستان میں اسلام کو بچا لیا، جس کو مسلمان اپنی زندگی کا اساس بنا کر انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہر قسم کے حوادث کا مقابلہ کرتے رہے، اور آج ہندوستان میں جہاں بھی قال اللہ اور قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ ولی اللٰہی خیالات سے متاثر ہونے والے ہی بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے، علماء کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے،

البتہ اخلاصِ نیت کی بناء پر جس طرح یہ کہا گیا ہے کہ تقویۃ الایمان پانچسو برس پہلے لکھی گئی ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا اسی طرح ایک بہت بڑا اگر وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ عالمگیر کے بعد ہی کوئی سید احمد بریلوی یا شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہو گیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی رہی کہ جب حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ جیسے عالی دماغ علماء پیدا ہوئے تو ان کے زمانے میں تخت پر عالمگیر جیسا بادشاہ

نہیں رہا، یا عالمگیر جیسے حکمراں کو حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ جیسے مجاہد، مفکر، سر بکف اور کفن بر دوش علماء نہیں ملے اسی لیے مسلمانوں کے عروج و کمال اور سقوط و زوال کی تاریخ ان کے سلاطین ہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی، جب تک تخت و تاج کو ہوشمند اور بیدار مغز حکمراں ملتے رہے، مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور تمدنی زندگی پر ناز رہا، اور جیسے ہی حکمراں طبقہ کی ہوش مندی اور عالی دماغی جاتی رہی، مسلمان اپنی شوکت و حشمت سے محروم ہو گئے، عام مسلمانوں نے سلاطین اور علماء دونوں کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کیا، کیونکہ دونوں اپنے کو اسلام کا محافظ اور پاسبان کہتے رہے، لیکن دونوں کی ہم آہنگی اور تعاون کی تاریخ زیادہ روشن نہیں، ایک دوسرے سے مشکوک اور آزردہ خاطر ہونے کے بجائے دونوں انجام بینی، مآل اندیشی اور مصلحت کوشی سے کام لے کر اپنی علمی اور ایمانی قوتوں کو ایک دوسرے کا سہارا بناتی رہتیں، تو مسلمانوں کی تاریخ کا نہج کچھ اور ہوتا،

یہ مقالہ طویل ہو رہا ہے، لیکن ابھی صوفیۂ کرام کے جو تعلقات سلاطین اور صوفیۂ کرام کے تعلقات علماء سے رہے اس کا حصہ باقی رہ گیا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت میں بڑے بڑے صوفیہ گذرے، جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی مذہبی روحانی اور معاشرتی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کیا، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام فاتحوں اور بادشاہوں کی تلواروں کی چھاؤں میں آیا اور ہر طرف پھیلا، لیکن ان فاتحوں اور بادشاہوں کے معاصر صوفیہ کے حالاتِ زندگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے تو اپنے دلوں کو انوار ربانی کا قصر بنایا، پھر لوگوں کو مادی نجاستوں اور آلائشوں سے پاک صاف کیا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا،

Marfat.com

ان کو برائیوں سے بچایا، بھلائیوں کے راستے پر لگایا، اخلاص ومحبت کا سبق پڑھایا، خدمت خلق اللہ کی تلقین کی، جس سے وہ لوگوں کے دلوں پر کچھ ایسا چھا گئے کہ شاہ وگدا، امرار وغربار، مسلم اور غیر مسلم سب ان کی سامنے جھکنے لگے اور ان کے آگے جھکنے کے معنی یہ تھے کہ وہ سب اسلام کے سامنے جھک رہے تھے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ علمار تو سلاطین سے مذہبی، فقہی مسائل اور طرز حکومت پر بہت الجھے، لیکن صوفیہ کرام ان سے الجھنے کے بجائے ان کی حکومت کے لیے خیر و برکت بن کر رہے، اسی لیے سلاطین سے ان کے تعلقات کی داستان علمائ اور سلاطین کے تعلقات کی نوعیت سے کچھ مختلف ہی،

مشائخ اور سلاطین سلاطین صوفیۂ کرام کے آستانوں پر برابر جھکتے رہے، مشہور ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کی دعوت پر شہاب الدین غوری ہندوستان آیا، التیتمش حضرت قطبُ الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، اور رات کو ان کے پاؤں بھی دابتا تھا، حضرت جلال الدین تبریزیؒ دہلی تشریف لائے تو اس نے خدم وحشم کے ساتھ دہلی سے باہر جاکر ان کا استقبال کیا، قاضی قطب الدین کاشانیؒ اس کے دربار میں آئے تو ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اسی طرح دربار میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا خیر مقدم تخت سے اتر کر کیا، اور ایک موقع پر ان کے قدموں پر بھی گر پڑا، بلبن اپنی شاہانہ شوکت وعظمت کے باوجود مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، اور حصول برکت کے لیے ان کے گھروں میں بے تکلف جاتا، وہ شیخ علی چشتیؒ کا بڑا گرویدہ تھا، ان کو لینے کے لیے چشت سے کچھ لوگ آئے، تو اس نے ان کے قدموں پر گر کر ان کو چشت جانے سے روکا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی لڑکی بی بی ہزیرہ کو

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے حبالۂ عقد میں دیا تھا، اس لحاظ سے سلطان ناصر الدین محمود اُن کا ہمزلف تھا، جلال الدین خلجی حضرت بو علی قلندر پانی پتی کا مرید تھا، علاء الدین خلجی بعض اسباب کی بنا پر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے توسل نہ رکھ سکا لیکن اوس نے اپنے دونوں لڑکوں خضر خاں اور شادی خاں کو ان کے حلقۂ ارادت میں دیدیا اور جب حضرت خواجہؒ کی مجلس سماع کے اشعار اُس کے سامنے دہرائے جاتے تو وہ ان کو آنکھوں سے لگاتا اور بار بار پڑھتا، قطب الدین مبارک خلجی سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومیؒ کا مرید تھا، سلطان محمد تغلق حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت شیخ علاء الدینؒ کا مرید تھا، اس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے جنازے کو کاندھا دیا اور ان کے روضۂ مبارک کی عمارت بنوائی حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ کی خانقاہیں بھی اسی نے تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ تغلق بھی حضرت شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا، وہ مشائخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ اس کے دربار میں تشریف لاتے تو تخت پر ساتھ بٹھاتے سلطان سکندر لودی حضرت سماء الدینؒ کا مرید تھا، بابر حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا، اور حضرت گنگوہیؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ سے اس کو نصیحت کی کہ وہ عدل قائم کرے، اوامر و نواہی کی پابندی کرے، نماز باجماعت ادا کرے، اور علماء کو دوست بنائے، ہمایوں حضرت غوث گوالیاریؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، اکبر کو شیخ سلیم چشتیؒ سے جو عقیدت رہی وہ اسکی زندگی کا اہم جزو ہے، ان ہی کی خاطر اس نے فتح پور سیکری کو تمام شہروں کا سرتاج

Marfat.com

بنادیا، اس کو جب کبھی ملکی اور فوجی کاموں سے فرصت مل جاتی تو حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوتا، میدانِ جنگ میں حضرت خواجہؒ سے حصول برکت کے لیے یا معین کا نعرہ بھی لگاتا، شہزادہ سلیم کی پیدائش کی خوشی میں حضرت خواجہ کے مزار پر حاضری دینے کے لیے آگرہ سے اجمیر تک پا پیادہ گیا، جہانگیر تو حضرت شیخ سلیمؒ کے سایۂ عاطفت میں پلا، اس لیے وہ بزرگوں، درویشوں، حتی کہ سنیاسیوں سے بھی بیحد عقیدت رکھتا تھا، کچھ دنوں اس کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اختلاف ضرور رہا، لیکن جب اس کی غلط فہمی دور ہوئی تو وہ حضرت مجددؒ کا بہت گرویدہ ہوگیا، ایک مشہور روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت مجددؒ کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھکو جنت میں لیجائیگا، تو تیرے بغیر نہ جاؤں گا، شاہ جہان بچپن ہی میں حضرت مجددؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیا تھا، عالمگیر نے سلوک وطریقت کی تعلیم حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت محمد معصومؒ سے پائی، فرخ سیر نے حضرت سید شاہ سلام اللہؒ سے بیعت کی، محمد شاہ رنگیلے کو شاہ مبارکؒ، شاہ بدہؒ، اور شاہ رمزؒ سے بڑی عقیدت تھی، عالمگیر شاہ ثانی کا قتل تو درویشوں سے اس کی غیر معمولی عقیدت مندی ہی کے سلسلہ میں ہوا، شاہ عالم کو حضرت شاہ فخر الدینؒ دہلوی سے بیعت تھی، بہادر شاہ ظفر بھی اُن ہی کا مرید تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے مولانا قطب الدین سے بیعت کی، ان کا وصال ہوا، تو ان کے خورد سال صاحبزادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی عقیدت قائم رکھی،

صوفیہ سے عقیدت کے اسباب | سلاطین کا صوفیہ کے آستانے پر جھکنے کے کئی اسباب تھے،

ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں اتنے جلیل القدر صوفیہ گذرے کہ وہ خواص و عوام دونوں کے دلوں پر چھائے رہے، انکی درویشی میں شاہنشاہی تھی، انکی قلندری میں شانِ سکندری تھی، سلاطین کے دربار میں عجم کا "حسنِ طبیعت" دکھائی دیتا تو ان بوریہ نشینوں کی خانقاہوں میں "عرب کا سوزِ دروں" ملتا تھا، ان کی حکمت ملکوتی اور علمِ لاہوتی سے لوگوں کے درد کا درماں ہوتا رہتا تھا، وہ شبنم بن کر جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا کر سکتے تھے، تو طوفان بنکر دلوں کو دہلا بھی سکتے تھے، اسی لیے وہ عوام و خواص کے مرجع بن گئے تھے، سلاطین بھی ان کا دامن پکڑنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے،

اس کے علاوہ بعض سلاطین علمار کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تو ان کو صوفیۂ کرام کے روحانی دامن میں پناہ ملتی تھی، صوفیۂ کرام ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے سلاطین میں اسلام کی اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے کبھی کبھی شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ضرور ہو جاتی، لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلا ان پر قائم رہتا، جس سے غیر شعوری طور پر حکومت و سلطنت کو فائدہ پہنچا، التمش جیسے دیندار بادشاہ کے دربار میں مولانا سید نور الدین مبارک غزنوی رح نے یہ وعظ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طرح سے وہ کھاتے ہیں، جو کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور سواری کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، وہ تمام چیزیں دینِ مصطفےٰ کے خلاف ہیں، لیکن حضرت بختیار کاکی رح اپنے مرید سلطان التمش کو شاہانہ شوکت و حشمت ترک کرنے کی تلقین کے بجائے اس کو خدا ترسی،

Marfat.com

پارسائی، تزکیۂ نفس، غمخواری دین، عدل پروری اور خدمتِ خلق کی تعلیم دیتے رہے، سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کی نمائش، خود پرستی اور فرعونیت کو علماء رسومِ جبابرہ کہتے رہے، وہ دربار کی ظاہری نمود و نمائش میں عجمی فرمانرواؤں کی تقلید کرتا تھا، جس کا رنگ مشرکانہ تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے تمام اکابر بزرگانِ دین سے فیوض و برکات حاصل کرتا رہا، اس کی درباری زندگی خواہ کیسی ہی رہی ہو لیکن اس کو حمیت اسلام اور شعار اسلام کا بڑا خیال رہا، اسی لیے صوفیہ بھی اس کا احترام کرتے، اس کے مرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے مشائخ جب اس کا نام لیتے تو اس کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ طاب اللہ ثراہ اور انار اللہ برہانہ بھی کہتے، جو عموماً صلحاء اور اخیار کے نام کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں، اس کے دربار کے بعض مشرکانہ رسوم کے باوجود خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اس کے مذہبی عقائد کی تعریف کی ہے،

حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں شب برات کی جو تقریبات منائی جاتی ہیں وہ غزنین، خراسان اور عرب میں دیکھنے میں نہیں آئیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے عوام سے ہے، جو دین سے بے خبر ہیں، اور وہ اس رات غیر شرعی چیزوں میں مشغول ہو کر اپنے اعمال کو سیاہ کرتے ہیں، وہ فیروز شاہ تغلق سے برابر ملتے رہے، جس نے ان سے مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کیے، لیکن اس کے دربار میں شب برات کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی، بے شمار مشعلین روشن کیجاتیں،

Marfat.com

طبل بجتے، آتشبازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے، مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سلطان کی اس شاہانہ تقریب کو ختم کر دینے پر مصر نہیں ہوئے،

سلاطین پر صوفیہ کے اثرات

صوفیۂ کرام اور سلاطین کی پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی، سلاطین کے مذہبی خیالات وجذبات کے نشو ونما میں ان بزرگوں کے فیوض وبرکات کا بڑا دخل رہا، شمس الدین ایلتتمش حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا مرید بنکر ویسا ہی فرمانروا ہوا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ راتوں کو جاگتا، کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، وہ بیدار ہوکر عالم تحیر میں کھڑا رہتا، اور اگر سو جاتا تو بیدار ہو جاتا، اٹھکر وضو کرتا اور مصلے پر جا بیٹھتا، وہ ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولی سے شریک ہوتا، عصر کی سنتیں کبھی قضا نہیں کیں، ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اس کو حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے جنازہ کی نماز پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی، عصامی نے فتوح السلاطین میں اس کو صاحب ولایت پارسا، صاحب شرع فرمانروا، غم خوار دین، خسرو دین پناہ، خسرو پاک دین اور خوش نفس وغیرہ جیسے القاب سے یاد کیا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر جا بجا عزت واحترام اور لطف ومحبت سے کیا ہے، بلکہ اس کے بعض قول اور فعل کو بطور نصیحت اپنے مریدوں کے سامنے نقل بھی کیا ہے،

سلطان ناصر الدین محمود پر اپنے باپ سلطان شمس الدین ایلتتمش کا بڑا اثر تھا، اسی لیے اس کو نہ صرف علماء سے محبت بلکہ مشائخ سے بھی مودت تھی، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کو حضرت بابا گنج شکرؒ سے بڑی عقیدت تھی، اور

Marfat.com

گر یہ روایت تسلیم کرلی جائے کہ وہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا ہم زلف تھا، تو ظاہر ہے کہ ان سے اس نے بڑا استفادہ کیا ہوگا، اس کے حبِّ رسول، لینت مروت اور دوسرے اوصافِ حمیدہ کے قصے بہت مشہور ہیں، مورخوں نے لکھا ہے کہ اس سلطان کے عجیب و غریب قصے خلفائے راشدینؓ کے حالاتِ زندگی سے ملتے جلتے ہیں، اس نے گو بائیسؔ برس تک حکومت کی، لیکن اس کی زندگی میں درویشانہ شان برابر قائم رہی، دربار عام میں آتا تو شاہانہ لباس میں ملبوس رہتا، لیکن دربار ختم کرنے کے بعد پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتا، اس کا زیادہ تر وقت عبادت، ریاضت، تلاوت کلام پاک، شب بیداری، ذکر اللہ میں گذرتا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس کے نام کے ساتھ بھی انار اللہ برہانہ اور رحمۃ اللہ علیہ تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں،

غیاث الدین بلبن پر حضرت شیخ علی چشتیؒ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ اور دوسرے مشائخ کا بڑا اثر رہا، اور ان ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ وہ عبادت، ریاضت، روزے، نفل اور شب بیداری میں غیر معمولی اہتمام رکھتا، نماز باجماعت پڑھتا، جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کرتا، اشراق، چاشت اوابین اور تہجد کی بھی پابندی کرتا، خواہ کوئی موسم ہو رات کو جاگتا، سفر و حضر میں اوراد و ظائف کو نہ چھوڑتا، کبھی بے وضو نہ رہتا، مشائخ کی بیحد تعظیم کرتا، ان میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو ان کے جنازہ میں شریک ہوتا، پھر ان کے سویم میں شرکت کرتا،

Marfat.com

جلال الدین خلجی کو نہ صرف حضرت ابو علی قلندرؒ بلکہ تمام مشائخ سے بھی بڑی عقیدت رہی اور اس میں غیر معمولی حلم، خدا ترسی، لینت و نرمی ان ہی کے اثرات سے پیدا ہوئی مولانا ضیاء الدین کا بیان ہے کہ ایسا حلیم، کریم اور خدا ترس بادشاہ کوئی اور نہیں ہوا علاء الدین خلجی کسی کا مرید تو نہ تھا لیکن ایک بار حضرت بو علی قلندرؒ نے اسکو شحنہ، دہلی لکھ کر یاد کیا، تو وہ خوش ہوا، پھر دوسری بار انھوں نے اس کو نوطہ دار دہلی لکھا تو اس نے کہا کہ اس کے لیے میں شکر ادا کرتا ہوں، وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی زیارت سے تو محروم رہا، لیکن ان کی دعاؤں کا برابر طلب گار رہا، مورخین اس کی تصویر اچھی نہیں پیش کرتے، لیکن حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اس کے متعلق بری رائے نہیں رکھتے ان کے ملفوظات کے کاتب شیخ حمید شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے مرنے کے بعد اس کی قبر لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گئی تھی، اور لوگوں کا عام عقیدہ تھا، جو کوئی اپنی مراد کی ڈوری اس کے مزار پر باندھے گا اللہ تعالیٰ اوسکی حاجتیں برلائے گا، حضرت امیر خسرو تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ علاء الدین نے رحمت خداوندی کی نشانیوں کو مصحف وجود کی جلد میں جمع کر دیا تھا، امیر حسن سجزی تو اس کو اپنے اشعار میں دین پرور، دین پناہ اور اسلام پرور وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں، عصامی نے بھی اس کو شاہ دین پرور لکھا ہے، عام طور سے علاء الدین خلجی سے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان کی تاریخی شہادتوں کے بعد علاء الدین کی مذکورۂ بالا تعریف و توصیف بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوگی، لیکن علاء الدین کے معاصروں کے ان بیانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا،

Marfat.com

مولانا ضیاء الدین برنی سلطان محمد تغلق کے بہت بڑے ناقد تھے، لیکن وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان کے کردار میں دو خاص باتیں تھیں، خدا کی بندگی اور بڑوں کی نیاز مندی، نیاز مندی سے مراد ہے کہ وہ درویشوں اور بزرگوں کی صحبت کا بڑا گرویدہ رہا، اور ان کی برابر سرپرستی کی، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اس کی بعض باتیں ایسی تھیں جن کو سننے کے بعد عجائبات معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شریعت کا پابند تھا، نماز کی بڑی تاکید کرتا تھا، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا، وہ منجملہ ان بادشاہوں کے ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی تھی، اس کی بے حد خواہش رہی کہ مشائخ اور صلحا اس سے تعاون کر کے حکومت کو سنوارنے میں امداد کریں، اسی لیے اپنے مرشد شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کے ایک صاحبزادہ شیخ معز الدینؒ کو گجرات کا ایک معزز عہدیدار بنا کر وہاں روانہ کیا، جہاں وہ شہید ہوئے، حضرت علاء الدینؒ کے دوسرے صاحبزادے شیخ علم الدین کو ہندوستان کا شیخ الاسلام بنایا، خواجہ کریم سمرقندی (بابا فرید الدین کی نواسی کے شوہر) کو شیخ الاسلام بنا کر ستگاؤں بھیجا، اس نے سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ رکن الدینؒ کو سو گاؤں جاگیر کے طور پر دیے،

شمس سراج عفیف نے لکھا ہے، کہ فیروز شاہ تغلق اپنے پورے عہد حکومت میں اولیائے کرام کی متابعت کرتا رہا، ہر وقت مشائخ کی محبت میں ان کی پیروی کی اور آخر زمانے میں مخلوق بھی ہو گیا تھا، علماء و مشائخ ہر وقت اس کے پاس رہتے اس لیے اس کو ہمیشہ مکروہ و حرام اشیاء کا علم رہتا تھا، اور ان ہی کے فیوض سے اس میں شریعت اور سنّت کی پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا رہا، وہ پانچوں وقت کی

نماز باجماعت ادا کرتا۔ روزانہ کلام پاک کی تلاوت کرتا، جمعہ کے دن سورۃ کہف اور جمعہ کی رات میں سورۂ طٰہٰ بلاناغہ پڑھتا تھا،

لودی سلاطین میں سکندر لودی حضرت سمارالدینؒ کا مرید تھا، اوران کے مرید شیخ جمالیؒ کی صحبت سے برابر فیضیاب رہا، اور ان بزرگوں کے اثر سے پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا، نفلیں بہت پڑھا کرتا تھا، صبح ہونے سے تین گھنٹے پہلے وہ جاگتا غسل کرتا تہجد کی نماز پڑھتا، اور پھر قرآن کے تین پارے ہاتھ باندھ کر اور کھڑے ہوکر پڑھتا تھا،

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صوم وصلوٰۃ کا بہت پابند تھا، اور حسنِ ادب کا یہانتک لحاظ رکھتا کہ بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیتا،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا شمار اکابر صوفیہ میں نہیں ہوتا، لیکن یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے، کہ جب تک وہ زندہ رہے اکبر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیکر دینداراور اسلامی عزت وناموس کا نگہبان بنائے رکھا، اور اب یہ الزام کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک صوفی نے تو اس کو صحیح راستہ پر لگائے رکھا لیکن علمار کے ایک گروہ نے اسکو اسلام سے بدظن کرکے ایک غلط راستہ پر لگا دیا، جہانگیر کو حضرت سلیم چشتیؒ سے مستفیض ہونے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ اس کے بچپن ہی میں ان کا وصال ہوگیا تھا لیکن وہ ان کی صاحبزادی کی گود میں پلا، جنھوں نے اس کو دودھ بھی پلایا، اور وہ ان ہی کو اپنی ماں تصور کرتا رہا، اسی لیے اس کو اپنی ماں مریم زمانی سے کم لگاؤ رہا، اس کی رضاعی ماں کا انتقال اس کے آٹھویں سال جلوس میں ہوا تو ان کے جنازے کو اپنے کاندھے پر اٹھاکر کچھ دور لے گیا، اور خود اپنی تزک میں لکھتا ہے، کہ کئی روز تک ان کی جدائی کے غم میں کھانے پینے اور کپڑے بدلنے کی خواہش نہیں ہوئی

اس کے بچپن کا ماحول مذہبی تھا، اس لیے اکبر کی بے راہ روی کے باوجود اس میں اسلامی غیرت وحمیت کا بڑا جذبہ رہا، اسی لیے اخیر میں وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بھی معتقد ہو گیا، اور ان کی ایمانی حرارت اور جہانگیر کی مذہبی غیرت کے تعاون سے اسلام کی شمع جو اکبر کے دور میں زرد پڑ چکی تھی، پھر سے منور ہو گئی، خود شاہ جہاں کی مذہبیت حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فیوض کا نتیجہ تھی، کیونکہ وہ بچپن ہی میں ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا، اور عالمگیر کو تو مجددی تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ہی سمجھنا چاہیے۔

صوفیۂ کرام کی تلقین کسی بادشاہ وقت کا محض مذہبی ہونا اس کے اچھے حکمران ہونے کی دلیل نہیں، مذہبی ہونے کے ساتھ اس میں حکمرانی کے تمام اوصاف بھی موجود ہوں، تو وہ پھر ایک قابل قدر حکمراں ہے، اسی لیے صوفیہ کرام نے سلاطین کی تعلیم و تربیت اپنے عام مریدوں سے مختلف انداز میں کی، اور خلق اللہ کی حاجت برآری اور عام عدل پروری پر زیادہ زور دیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عام تعلیم تھی کہ حاجتمندوں کی مدد کرنے والا اللہ کا دوست ہے، اگر کوئی شخص اوراد و وظائف میں مشغول ہو، اور کوئی حاجت مند آجائے تو لازم ہے کہ وہ اوراد و وظائف کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو، اور اپنے مقدور کے مطابق اس کی حاجت پوری کرے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سلطان ایلتتمش کو برابر رعایا، فقیروں، غریبوں اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین فرماتے رہے،

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بھی مظلوموں کی حمایت کی تلقین کرتے رہے، اجودھن کے ایک عامل کو شکایت تھی کہ وہاں کا والی اس پر مہربان نہیں ہے،

Marfat.com

حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے اس کی سفارش والی سے کی، لیکن والی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، حضرت گنج شکرؒ نے عامل سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تمہاری سفارش والی سے کی اور اس نے نہ سنی، اسی طرح تم سے بھی کسی نے کسی مظلوم کی سفارش کی ہوگی اور تم نے نہ سنی ہوگی، یہ سن کر عامل متاثر ہوا، اور ظلم کرنے سے توبہ کی، حضرت نظام الدین اولیاؒ صوم دہر کے باوجود افطار میں کوئی چیز چکھ لیتے، اس کے بعد سحری میں کچھ کھاتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اس وقت کچھ نہ کھاتے، خادم عرض کرتا کہ اگر آپ اس وقت میں کچھ نہ تناول فرمائیں گے تو کمزوری آجائے گی، قوت برقرار نہ رہے گی، یہ سن کر روتے اور فرماتے کہ بھوکوں، مسکینوں اور درویشوں کے فاقہ کو سوچتا ہوں تو حلق سے کھانا نیچے نہیں اترتا، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو شخص اپنا غم والم مجھ سے بیان کرتا ہے تو اس کو سنکر میرا رنج وغم دوچند ہوجاتا ہے، معلوم نہیں وہ لوگ کیسے ہیں جو دوسروں کے غم والم کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور آہ نہ کریں، ان پر بڑا تعجب ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے کسی سلطان وقت سے تعلق تو نہیں رکھا، لیکن خلق اللہ کے ساتھ ان کی غمخواری کا اثر خواص وعوام دونوں پر رہا،

شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق جب تخت نشین ہوا، تو حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ نے سلطان کو پیغام دیا کہ آپ وعدہ کریں کہ خلق اللہ کے ساتھ عدل وانصاف کریں گے، ورنہ ان بیکس ہندوؤں کے لیے اللہ تبارک تعالی سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے، سلطان نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خداوند تعالی کے بندوں سے حلم وبردباری کے ساتھ

Marfat.com

پیش آؤں گا، اور ان پر انصاف و محبت سے حکومت کروں گا، حضرت شیخ نے یہ جواب سنا تو کہلایا کہ اگر آپ خلق اللہ کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئیں گے تو ہم بھی اللہ تبارک تعالیٰ سے آپکے لیے چالیسؔ سال کی حکومت کے لیے دعا کریں گے، اور آخر کار وہی ہوا جو شیخ نے فرمایا تھا،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بھی فیروز شاہ تغلق کو اپنے مکتوب میں عدل و انصاف کی تلقین کی، اور اس کو ایک حدیث لکھ کر بھیجی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے خدائے تعالیٰ قیامت کے روز پل صراط کو عبور کرنے میں اس کی مدد کرے گا، اور بہشت میں جگہ دے گا، اور جو کوئی مظلوم کو دیکھتا ہے، اور وہ مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر اس کو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے، پھر ایک دوسری حدیث یہ بھی تحریر فرمائی کہ جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے اس کے لیے تہتر مغفرت لکھی جاتی ہے، ان میں سے ایک تو اس کو دنیا میں مل جاتی ہے اس سے اس کا کام سدھرتا ہے، اور بقیہ بہتر عقبیٰ میں ملتی ہے، ایک تیسری حدیث اس کو یہ بھی لکھی کہ پیغمبر علیہ السّلام نے فرمایا، ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، ان کے ایک دوسرے مکتوب میں ہے کہ امراء اصحاب منصب اور ارباب قدر و منزلت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچنے کا سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ وہ عاجزوں کی دست گیری، اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کریں، چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے، ان بزرگ سے یہ کہا گیا کہ جس شہر کے رہنے والے ہیں اسکا بادشاہ شب بیدا ہے نفل نماز میں بہت پڑھتا ہے، . . . . . .

Marfat.com

نفل روزے بھی رکھتا ہے، فرمایا بے چارے نے اپنے کام کو تو کھو دیا ہے، لیکن دوسرے دن کے کام میں لگا ہوا ہے، لوگوں نے ان بزرگ سے پوچھا کہ آخر اس بادشاہ کا اپنا کام کیا ہے، تو فرمایا کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکوائے اور بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلوائے، طرح طرح کے کپڑے سلوائے، اور ننگوں کو پہنوائے، اجڑے ہوئے دلوں کو آباد کرے، حاجتمندوں کی دست گیری کرے، نفل نمازیں پڑھنا اور نفل روزے رکھنا تو درویشوں کا کام ہے،

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ خود ایک مملکت کے حکمراں رہ چکے تھے اس لیے اپنی درویشی کے زمانے میں حکمراں طبقہ کو برابر نصیحتوں سے مستفید کرتے رہے، ایک ملفوظ میں تو فرمایا کہ جہانداری اور شہریاری کو چار چیزوں سے نقصان پہنچتا ہے، (۱) سلاطین کا لذائذ دنیا میں مستغرق ہو جانا (۲) اپنے مقربین کے ساتھ بدخلقی سے پیش آنا (۳) سزا دینے میں زیادتی کرنا (۴) رعیت پر ظلم کرنا، اور پھر دوسرے ملفوظات میں فرمایا کہ بادشاہ اپنے وقت کو اس طرح ترتیب دیں کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں، پھر علماء و صلحاء کے ساتھ صحبت رکھیں، اور چاشت کے وقت تک اُن سے عدل و انصاف کے متعلق قرآنی آیتوں کے مطالب پوچھیں، اسی جگہ وزیروں اور ندیموں کو بلائیں اور یہ لوگ نوجوں کے جو معروضات پیش کریں ان کا مناسب جواب دیں، ہر شخص کے مدعا کو پورا کریں، اس کے بعد دربار عام ہو، جس میں رعایا اور مسلمانوں کے قضایا اور دعاوی پیش ہوں، اور شریعت کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو، عدل و انصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کریں تاکہ سلطنت میں خلل واقع نہ ہو،

Marfat.com

حضرت خواجہ گیسو دراز اپنی تصنیف خاتمہ میں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ راہ سلوک میں گامزن ہو تو سلطان ابراہیم ادہم، معاویہ ثانی اور عبداللہ بن زبیرؓ بن سکتا ہے، لیکن اگر کوئی بادشاہی کے لیے موزوں ہو تو پھر اسی ...... فرض کو انجام دے، سلوک کی طرف مائل نہ ہو، اور حکومت میں ایسے متدین اور صالح لوگوں کو عہدہ دار مقرر کرے کہ جو شرعی احکام کو نافذ کرا سکیں اور فقیروں، کمزوروں، یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں، گونگوں، بیواؤں کی پوری خبرگیری کریں، ان کو برباد ہونے سے بچا لینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں،

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے سکندر لودی کو ایک مکتوب میں یہ لکھ بھیجا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر اور فاضل تر ہے، اور پھر اس کو ایک حدیث بھی لکھ بھیجی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب شخص انصاف پسند امام ہوگا، اسلیے کہ اسکے عدل کی منفعت اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کیلئے تھی، پھر وہ شخص اون سات آدمیوں میں ایک آدمی ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں رکھے گا اس دن اس کے سایہ کی علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا،

بابر کی حکومت قائم ہوئی تو حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اس کو بھی ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ عالی ظرف لوگ دنیا کو آخرت کی ایک کھیتی سمجھتے ہیں، اور جو کچھ دنیا میں کرتے ہیں خدا ہی کے لیے کرتے ہیں، اللہ کے حکم کی تعظیم خلق اللہ کی شفقت سے وابستہ ہے، اور اسی پر عمل کرنے سے ابدی فلاح حاصل ہوتی ہے، آپ کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنے کی خاطر لوگوں کے سروں پر عدل کا سایہ اس طرح قائم کریں کہ کوئی شخص بھی کسی پر ظلم نہ کرے، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ہمایوں کو بھی اسی قسم کی تلقین کی،

Marfat.com

عدل پرور سلاطین

خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی موثر تعلیم اسلام نے دے رکھی ہے، مملوک سلاطین کی حکومت دہلی میں قائم ہوئی تو ان کے سامنے غزنوی اور غوری دربار کی عدل پروری کی روایات پہلے سے موجود تھیں، ہندوستان کے صوفیہ کرام کی مزید تعلیم و تلقین نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، اور شاید ہی کوئی فرمانروا ایسا گزرا ہو جو عدل پرور نہ رہا ہو، فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکرؓ کی اور عدل میں حضرت عمرؓ کی تقلید کرنے کی کوشش کی، حضرت بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں ہے، کہ التتمش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جو لوگ بھی فاقہ کرتے ہوں اس کے پاس لائے جائیں، اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا، اور ان کو قسمیں دیکر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آکر عدل و انصاف کی زنجیر جو باہر لٹکی ہوئی ہے، ہلائیں تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی، غیاث الدین بلبن کے بارہ میں مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ دادرسی اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا، اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لیتا اس کے دل کو آرام نہ پہنچتا، انصاف کرتے وقت اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ظلم کرنے والا اس کا حامی و مددگار ہے، اس کے لڑکے، اعزہ، مخصوصین، والی، اور مقطع اس کی عدل پروری سے واقف تھے، اس لیے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کریں، اس کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور رہے ہیں، خود اس زمانہ کے ہندوؤں نے اسکی حکومت کو دل کھول کر سراہا ہے، ۱۳۳۷ء بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء کا ...

Marfat.com

ایک سنسکرت کتبہ پالم میں ملا ہے، جس میں لکھا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں آسودہ حالی ہے، اس کی بڑی اور اچھی حکومت میں غور سے غزنہ اور ڈراوڑ سے رامیشورم تک ہر جگہ زمین پر بہار ہی بہار کی دل آویزی ہے، اس کی فوجوں نے ایسا امن و امان قائم کیا ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کی خبر گیری ایسی اچھی کرتا ہے کہ خود وشنو دنیا کی فکر میں آزاد ہو کر دودھ کے سمندر میں جا کر سو رہے ہیں، امیر خسرو علاء الدین خلجی کے بارہ میں خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں کہ اس نے، حضرت عمرؓ کے ایسا عدل قائم کر رکھا ہے، اور عوام کے معاملات میں وہ المنتصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے، محمد بن تغلق کے بارہ میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ وہ عدل نوازی کے سلسلہ میں مشائخ اور علماء کی بھی رورعایت نہ کرتا، وہ اگر مجرم ہوتے تو ان کو بھی بلا تامل سزائیں دیتا، مسالک الابصار میں ہے کہ سلطان ہفتہ میں ہر شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا، اور اس کے افتتاح کے موقع پر ایک نقیب بلند آواز سے پکارتا کہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں جس کو کوئی شکایت ہو یا جو حاجت مند ہو، وہ حاضر حضور ہو جائے، نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے اور سامنے کھڑے ہو کر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے، اثنائے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہ تھی، تاریخ مبارک شاہی اور ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ دونوں میں ہے کہ سلطان نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کے فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کی گردن پر ہوگا،

Marfat.com

اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی، موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کی حکومت عدل وانصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم و تعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں مکمل امن وسکون تھا، چیزوں کی فراوانی تھی، اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن تھے، عام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی تھی،

سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی، اس کو مغل بادشاہوں نے اور بھی شاندار طریقہ پر برقرار رکھا، بابر نے اپنی تزک میں خود لکھا ہے کہ اس کی فوج بھیرہ سے گذر رہی تھی، تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے، اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، تو فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا، اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ۱/۲ پہر عدل وانصاف کے لیے مقرر کر رکھا تھا، جہانگیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزآنہ عوام کی شکایتیں سنتا اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی، تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کر سکے، وہ سفر میں بھی ہوتا تو روزانہ تین گھنٹے بیٹھکر فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، علالت کے زمانہ میں بھی اس کا یہ معمول جاری رہتا، اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے :-

بہر نگہبانی خلق خدا شب نکنم دیدۂ بخواب آشنا
از پئے آسودگی جملہ تن رنج پسندم بہ تن خویشتن

وہ تو نورجہاں کو بھی ایک عورت کے شوہر کو ہلاک کرنے پر موت کی سزا دینے کیلئے

تیار ہو گیا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی کی نظم "عدل جہانگیری" سے ظاہر ہو گا،

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے، جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہنچ سکتا تھا، جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدیدار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا، اور پھر مناسب کارروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا، شاہ جہان نے گجرات کے ناظم حافظ محمد نصیر کو حبس دوام کی سزا اس لیے دی کہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ وہ ظالمانہ طریقہ پر پیش آتا تھا، اسی طرح ایک بار بنگال کے ناظم فدائی خاں کو اس کے عہدہ سے برطرف محض اس لیے کر دیا کہ عوام اس کے شاکی تھے، اورنگ زیب کے ناقدین بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتے کہ وہ عدل پرور نہیں تھا، اس نے شاہ جہاں کو اسکی معزولی کے بعد ایک رقعہ میں لکھا کہ خداوند تعالیٰ اسی کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

اور اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے، انھوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا، لیکن یہاں کے غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور رہے، اور مسلمانوں کو بھی اوامر و نواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی، اور ان کی معاشرتی

Marfat.com

زندگی کو درہم برہم نہیں کیا، اکبر نے انسان دوستی کے جذبہ سے ستی کی رسم کو روکنے کی کوشش کی، کمسن بیواؤں کے رواج کو بھی ختم کر دینا چاہا، بچپن کی شادی کے خلاف بھی کچھ عملی کارروائی کی، لیکن اپنی ہمدردانہ خواہشوں کو کبھی تلوار کی نوک سے عمل میں نہیں لایا، بعض فرمانرواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن نئی تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں، ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یوپی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگین رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا، اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی، اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں، اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، صوفیہ کرام نے خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی، اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا، اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہنچی،

سلاطین کی مدح سرائی، | اب تک سلاطین کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ممکن ہے کہ محض جانبدارانہ مدح سرائی سمجھی جائے، اور انگریزوں اور ان کے ہمنوا مورخوں کی تاریخ پڑھنے والوں پر یہ گراں گذرے لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جن سلاطین کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کے دور عروج کے اچھے حکمراں تھے، اگر ان میں واقعی یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو خون سے ہولی کھیلنے والے، ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والے، اپنے سینوں کو نوک شمشیر اور نوک سنان سے چھلنی کرنے والے راجپوت

Marfat.com

کی سرزمین میں ان کا اور ان کے ہم مذہبوں کا قدم جمنا آسان نہ تھا، اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت کے دورِ عروج میں زیادہ تر اچھے حکمراں گذرے، مملوک سلاطین میں آرام شاہ، رکن الدین فیروز شاہ، معزالدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور کیقباد جیسے بے جان حکمراں بھی گذرے، لیکن اسی خاندان میں ایلتتمش کی نیک نفسی اور انتظامی کارکردگی، بلبن کے جاہ وجلال اور عدل گستری کی بدولت حکومت کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی، خلجی، سلاطین کے عہد میں قطب الدین مبارک شاہ جیسا رند اور ناصر الدین خسرو جیسا مفسد حکمراں بھی ہوا، لیکن ان کے عہد کی بدعنوانیاں اور کمزوریاں ان کے پیشرو سلطان علاء الدین خلجی کی نبرد آزمائی اور رعایا پروری سے دب کر رہ گئیں، ان کے خاندان کو تو ان سے نقصان پہنچا لیکن حکومت برقرار رہی، غیاث الدین کی مردانگی اور فرزانگی، محمد بن تغلق کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی اور فیروز شاہ کی غیر معمولی رحمدلی اور رعیت نوازی سے جو قوت بنی اس کے سہارے ان کے کمزور جانشین کچھ عرصہ تک حکومت کرتے رہے، ابراہیم لودی کو اپنی کمزوریوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا، ان میں سے اچھے سلاطین کی اچھائیوں کا ذکر کرنے میں جس طرح منہاج سراج (مولف طبقات ناصری) مولانا ضیاء الدین برنی (صاحبِ تاریخ فیروز شاہی) اور شمس سراج عفیف (کاتب تاریخ فیروز شاہی) نے فیاضی سے کام لیا ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخین میں کے، ایس لعل نے اپنی تاریخ ہسٹری آف دی خلجیز، ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونہ ٹرکس، اور ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے پولیٹکس ان پری موغل ٹائمس" میں قابلِ قدر سلاطین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے،

مغل خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں کے حربی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس خاندان کے آخری ۱۳ نااہل اور نالائق حکمران ان ہی شاندار کارناموں کی بدولت ڈیڑھ سو برس تک تخت و تاج کے مالک بنے رہے، اور جس طرح نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری، ابوالفضل نے اکبرنامہ مستعد خاں نے اقبال نامۂ جہانگیری، ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر مغل بادشاہوں کے قابل قدر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے، اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخوں میں ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے رائیز آف دی موغل امپائر، ڈاکٹر بنی پرشاد نے ہسٹری آف جہانگیر اور بنارسی پرشاد نے ہسٹری آف شاہجہاں لکھ کر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان حکمرانوں کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے، البتہ عالمگیر کی تعریف و توصیف میں جس طرح عالمگیر نامہ کے مصنف کاظم شیرازی کا قلم چلا ہے، اس طرح سر جدو ناتھ سرکار کا نہیں چل سکا ہے، لیکن اس بادشاہ کے عظیم المرتبت ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ سر جدو ناتھ سرکار جیسے دیدہ ور مورخ نے اس بادشاہ کی تاریخ لکھنے میں بیس برس کی مدت گذاری اور بڑی کد و کاوش کے بعد اس کی تاریخ پانچ جلدوں میں مرتب کی، آج تک کسی نااہل بادشاہ کی تاریخ اتنی جلدوں میں نہیں لکھی گئی،

مغل خاندان کے پہلے چھ حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں مورخین کے قلم میں جو رنگینی اور توانائی پائی جاتی ہے، وہ ان کے جانشینوں کے عہد کے مورخوں میں نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے اچھے سلاطین کا مطالعہ خواہ کتنے ہی تعصب کے ساتھ کیا جائے اچھے ہی رہیں گے، اس لیے ان کی اچھائیوں کے ذکر میں قلم خواہ مخواہ رقص کرنے لگتا ہے،

اچھی معاشرت اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے دورِ عروج میں بھی سلاطین جانشینی کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے، بعض شہزادے قتل کیے گیے، بعض کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری گئیں، بعض قید خانے میں ایڑیاں رگڑتے رہے، اسی طرح امراء میں بھی باہمی رقابت رہی، سازشوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے، ان کی وجہ سے جا بجا بغاوتیں بھی ہوتی رہیں جن سے کبھی حکومت کی مرکزیت خطرے میں پڑ جاتی، لیکن ان بدعنوانیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کی معاشرت کا سانچہ اور ڈھانچہ بہت زیادہ بگڑنے کے بجائے بنیادی طور پر مضبوط اور مستحکم رہا، اسی لیے اچھی معاشرت کی بدولت اچھے سلاطین پیدا ہوتے رہے، جو برے حکمرانوں کی لائی ہوئی برائیوں کا کفارہ بن جاتے،

اچھی معاشرت کے معمار صوفیہ کرام اور یہ حقیقت ہے کہ اچھی معاشرت اچھے صلحاء اور صوفیہ کے طفیل میں ہی بنتی رہی،

اکابر صوفیہ انابت، عبادت اور ریاضت شاقہ کے بعد تمکین و تلوین، مجاہدہ و مشاہدہ کی منزلیں طے کرکے اور عالم ملکوت و جبروت و لاہوت کی دولت سمیٹ کر کے خانقاہوں میں رشد و ہدایت کے لیے بیٹھ جاتے تو ان کی ذات تجلی ربانی و روحانی کی ایک شمع بن جاتی، اور لوگ پروانہ وار انکے ارد گرد جمع ہوجاتے، اور وہ لوگوں کے اخلاق و سیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونے سے سنوارنے کی کوشش کرتے، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کا مرکز علماء کا حلقہ درس و تدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا، اور نہ سلاطین کے درباروں میں اسکے جلوے دکھائی دیے، بلکہ مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم صوفیہ کرام کی خانقاہوں میں ہوئی، اور جب یہاں کے غیر مسلم باشندے مسلمان حکمرانوں ...

Marfat.com

کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اسلام سے آزردہ اور خوف زدہ ہو رہے تھے، تو ان فقر و فاقہ والے بزرگوں کے تزکیۂ باطن اور تہذیبِ نفس کو دیکھ کر ان کے دلوں پر اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہوئی،

کرامات ان بزرگانِ دین کے حالات زندگی ایسے لکھے نہیں گئے جیسے ہونے چاہئیں، اور جو حالات ان کے معاصر تذکروں میں لکھے گئے ان کو پڑھ کر آجکل کے کچھ لوگوں کو ان کی زندگی صرف کرامتوں میں گھری ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ ان سے کرامتیں صادر ہوتی رہیں، ہندوستان کے سریع الاعتقاد لوگ سادھوؤں، رشیوں اور منیوں کے خوارقِ عادات سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ ان بزرگوں کو بھی کرامتوں کے ذریعہ سے تسخیرِ قلوب کرنا پڑا، لیکن ان کے یہاں اظہار کرامت کوئی اہم چیز نہیں چشتیہ سلسلہ میں راہ سلوک کے پندرہ درجے مقرر ہیں ان میں پانچواں درجہ کشف و کرامات کا ہے، اس درجے کے حاصل ہونے کے بعد سالک کشف و کرامت کے ذریعہ سے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے اظہار سے وہ بقیہ درجات سے محروم ہو جاتا ہے، اسی لیے حضرت بابا گنج شکرؒ نے خواجگان چشت کے مسلک کے مطابق صوفی کو کشف و کرامت کے اظہار سے منع کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس کا اظہار کرنا پست حوصلہ والوں کا کام ہے، اس سے نفس میں تکبر پیدا ہوتا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بھی کرامت کے اظہار کی ممانعت سختی سے کی ہے، اور اپنے ملفوظات میں یہ بیان کیا ہے کہ ایک بار خواجہ ابوالحسن نوائی دجلہ کے کنارے پہنچے، تو دیکھا کہ ایک ماہی گیر دریا میں جال ڈال رہا ہے، خواجہ ابوالحسن نوائی نے ماہی گیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر میں صاحبِ

Marfat.com

ولایت و کرامت ہوں گا تو تمھارے جال میں میرے کہنے سے ڈھائی من وزن کی ایک مچھلی پھنسے گی اور مچھلی ٹھیک اوسی وزن کی ہوگی، نہ کم نہ زیادہ۔ اونکے کہنے کے مطابق واقعی اوس وزن کی مچھلی پھنس گئی، اس کی خبر شیخ جنید قدس سرہٗ کو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کاش اس جال میں ایک مار سیاہ پھنستا اور ابوالحسن کو کاٹ لیتا کہ وہ ہلاک ہو جاتے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں، جواب دیا کہ اگر سانپ ان کو کاٹ لیتا تو وہ شہید ہو جاتے، لیکن اپنی کرامت کے بعد زندہ رہے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان کا خاتمہ کس طرح ہوا،

اصلی کرامت ان بزرگانِ دین کی اصلی کرامت ان کی نفس کشی تھی، ان کا قول تھا کہ دریا کی سطح پر چلنا، آگ میں کود کر زندہ نکل آنا، پہاڑ کو ناخون سے کھود کھود کر گرا دینا آسان ہے، لیکن نفس کو قابو میں رکھنا آسان نہیں، اسی لیے وہ نفس کشی کے لیے ہر قسم کا مجاہدہ کرتے، حضرت خواجہ معین الدینؒ رات کو کم سوتے اور بالعموم عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، عبرت حاصل کرنے کے لیے قبرستان میں قیام فرماتے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بیس برس تک رات کو اطمینان سے نہ سوئے اور نہ زمین سے پیٹھ لگائی، حضرت بابا گنج شکرؒ عالم تفکر میں ایک عرصۂ دراز تک کھڑے رہتے، مطلق نہ بیٹھے، ان کے پاؤں سوج گئے تھے، اور ان سے خون بہتا تھا، اس درمیان میں ان کو یاد نہیں کہ انھوں نے کچھ کھایا ہو، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ صائم الدہر رہے، صرف افطار اور سحری کے وقت آدھی یا زیادہ سے زیادہ ایک روٹی سبزی یا تلخ کریلہ کے ساتھ کھاتے، لیکن کبھی کسی لقمہ میں لذت محسوس ہوتی تو اس کو منہ سے نکال کر دسترخوان پر ڈال دیتے، تاکہ کام و دہن لذت آشنا نہ ہونے پائیں، اسی لیے ان کے دسترخوان سے ادھ چبے نوالے بھی

Marfat.com

پائے جاتے، وہ تمام رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، اور ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بیخودی و وارفتگی طاری رہتی، صبح ہوتی تو شغل باطن سے آنکھیں سرخ رہتیں، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اپنی ابتدائی ریاضت کے زمانے میں کھانے پینے سے پرہیز کرتے، جب کبھی ان پر اشتہا کا غلبہ ہوتا تو درخت کی پتیاں کھا کر بھوک کی شدت رفع کر لیتے، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ اپنے مجاہدے میں دس دس روز تک کچھ نہ کھاتے، اور جب خواہشات کا غلبہ ہوتا تو لیمو کا عرق پی لیتے،

ان بزرگوں کے یہاں فقر وفاقہ کی بڑی اہمیت تھی، ان کا خیال تھا کہ فقر وفاقہ سے نفس میں فنا دگی اور دل میں عاجزی پیدا ہوتی ہے، اگرچہ بھوک سے جسم بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن دل کو روشنی اور جان کو صفائی حاصل ہوتی ہے، کھانے سے گناہوں کا مادہ بڑھتا ہے، اور فاقہ سے سب اطاعتوں کی اصل ملتی ہے، اور سب سے بڑھ کر اسی سے نفس کشی ہوتی ہے،

اس نفس کشی کے ذریعہ سے صوفیہ کوشش کرتے کہ ان میں حضرت آدمؑ کی توبہ، حضرت ادریسؑ کی عبادت، حضرت عیسیٰؑ کا زہد، حضرت ایوبؑ کی رضا، حضرت یعقوبؑ کی قناعت، حضرت یونسؑ کا مجاہدہ، حضرت یوسفؑ کا صدق، حضرت شعیبؑ کا تفکر، حضرت نوحؑ کا اخلاص، حضرت ابراہیمؑ کا شکر، اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہو جائے،

اور جب ان کو یہ چیزیں حاصل ہو جاتیں تو وہ رشد و ہدایت کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے۔۔۔ اور ایک طرف سلاطین کا تخت و تاج ہوتا تو دوسری طرف

ان کی فقیری کے جلوے ہائے صد رنگ ہوتے، بادشاہوں کے درباروں میں جاہ، حشمت، دولت، ثروت اور رتبہ ملتا، لیکن ان فقیروں کے درباروں میں توحید ایمان، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تواضع، اخلاص، قناعت، صدق و صفا محبت رسول، خدمت خلق اللہ، حلم وعفو، حقوق ہمسایہ، محبت و مودت وغیرہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ملتی رہی،

سلاطین اور صوفیہ کی زندگی کا تفادت، دونوں اپنے اپنے حلقے کے حکمراں تھے لیکن ان دنیادی اور روحانی حکمرانوں کی زندگی میں بڑا تفادت تھا، سلاطین کے لباس و پوشاک میں بڑی نمائش ہوتی، ان کے تاج، قبا اور پٹکے میں موتی اس طرح آویزاں ہوتے کہ پٹکے کی چمک کمر تک، قبا کی گلے تک اور تاج کی سر تک ہوتی، ان کی بعض پوشاک میں چوڑے چوڑے زردوزی کا کام ہوتا، گلے پر جو کام کیا جاتا وہ جواہرات سے سجایا جاتا اور اس میں یاقوت اور ہیرے ٹانکے جاتے، اور بعض لباس میں اس قدر جواہرات ٹکے ہوتے تھے کہ کپڑے کا رنگ نظر نہیں آتا تھا،

سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں منقش فرش بچھایا جاتا، زربفت کے پردے لٹکائے جاتے، چاندی اور سونے کے برتن رکھے جاتے، جن میں میوے، شربت اور پان رکھ کر اہل مجلس کی تواضع کی جاتی تھی، سلطان معز الدین کیقباد نے ایک سال جشن نوروز منایا تو اس موقع پر زربفت، اطلس، یاقوت، زری کے کام اور دوسرے قیمتی کپڑوں کی نمائش سے دربار کو جنت بنا دیا، جمنا کے بیچ میں زر و جواہر سے ایک مصنوعی چمن بنایا گیا تھا، محل کے در و دیوار اور فرش سونے اور موتیوں سے ایسے آراستہ کیے گئے تھے، کہ فردوس بریں کا دھوکا ہوتا تھا، مسالک الابصار کے

مصنف کا بیان ہے کہ جو شان و شوکت، جاہ و جلال اور کر و فر سکندر ذوالقرنین اور ملک شاہ بن الپ ارسلان کے دربار میں تھا، وہی محمد بن تغلق کے دربار میں نظر آتا تھا،

لیکن ان بادشاہوں کے اسی دارالسلطنت میں اکابر صوفیہ کی خانقاہوں میں بوریا کے سوا کچھ نہ تھا، ان کے کپڑے پھٹ جاتے تو پیوند لگا دیتے، بعض اوقات ناداری کی وجہ سے پیوند بھی نہیں لگا سکتے تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فقیرانہ لباس میں دوہرا بخیہ ہوتا تھا، اگر وہ پھٹ جاتا تو جس رنگ کا کپڑا مل جاتا اسی کا پیوند لگا لیا کرتے تھے، اسی پر ان کے سلسلہ کے تمام بزرگوں کا عمل رہا، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے کپڑے پھٹ جاتے تو بھی علیحدہ نہ کرتے تھے، ایک بار کرتہ بہت ہی بوسیدہ ہو گیا تھا، ایک شخص نے نیا کرتہ نذر کیا، کرتہ پہن تو لیا لیکن فرمایا جو ذوق مجھکو اس پرانے کرتہ میں حاصل تھا، اس نئے کرتہ میں نہیں ہے، جس کمبل پر دن کو بیٹھتے، اسی کو رات کے وقت اپنا بستر استراحت بناتے، حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے ملفوظات میں ہے کہ کوئی دنیادار ان سے ملنے آتا تو وہ شیخ کا جبہ پہنکر بیٹھ جاتے، اور جب وہ چلا جاتا تو کھاروے کا لباس پہن لیتے، شیخ کا جبہ پہنکر لوگوں سے اپنے فقر کو پوشیدہ رکھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مشہور خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ بڑے نحیف و منحنی تھے مرشد سے تعلیم و تربیت پانے کے زمانے میں ایک بار ان کے دونوں زانوؤں میں درد رہنے لگا تھا، اس لئے کمبل کو دو تہ کرکے اس پر بیٹھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو اس کی خبر ہوئی تو ان کی یہ تن آسانی ان کو پسند نہ آئی، اور جب ...

Marfat.com

حضرت برہان الدین غریبؒ حضرت خواجہ کی خانقاہ میں آکر جماعت خانہ میں آئے تو حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ وہ جماعت خانہ میں نہ بیٹھیں، حضرت برہان الدین غریبؒ گھر جاکر سوگ میں بیٹھ گئے، اور برابر روتے رہتے، ان کی تعزیت کے لیے لوگ آتے تو ان کے ساتھ وہ بھی روتے، بالآخر حضرت امیر خسرو بیچ میں پڑے اور وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کو ان کی دستار ان کی گردن میں ڈال کر حضرت خواجہ کے پاس لے گئے تو انھوں نے تقصیر معاف کی اور تجدید بیعت سے مشرف کیا،

اس زمانہ میں محل میں کوئی دعوت ہوتی تو دستر خوان پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کے کھانے ہوتے، شربت قند کے سینکڑوں پیالے رکھے رہتے، منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شربت گلاب بھی ہوتا، انواع واقسام کے حلوے ہوتے، روٹیوں میں نانِ تنگ، کاک اور سنبوسے وغیرہ کی کئی قسمیں ہوتیں، پلاؤ کے بھی کئی اقسام ہوتے، کسی میں گوشت، کسی میں خرمہ اور کسی میں انگور پڑا ہوتا، بکرے، دنبے، بیٹر، تیتر، تیہو اور چرز کے قورمے اور کباب ہوتے، کھانے کے بعد بنیذ کا بھی دور چلتا، لیکن معاصر اکابر صوفیہ کے گھروں اور خانقاہوں میں ان مادی آلائشوں کے بجائے فقر و فاقہ، تنگی، عسرت اور ناداری کے سوا کچھ نہ ہوتا، سلطان شمس الدین التتمش کے مرشد حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے گھر میں برابر فاقہ رہتا، جب کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تو ان کی حرم محترم پڑوس کے بقال کی بیوی سے ایک ٹنکہ یا ایک بہلول قرض لیکر خورد و نوش کا انتظام کرتیں، جب کہیں سے کچھ میسر ہوتا تھا تو قرض ادا کر دیا جاتا تھا،

حضرت فرید الدین گنج شکر کے یہاں بھی اکثر فاقہ ہوتا تھا، ایک روز انگی

اہلیہ محترمہ نے آکر عرض کیا کہ فلاں لڑکا بھوک سے مر رہا ہے تو فرمایا، فرید کیا کرے، اگر تقدیر الٰہی یہی ہے تو یہی ہوگا، ان کو دلیہ پسند تھا، اس کو عام طور سے نمک اور سرکہ ڈالکر پکایا جاتا تھا، ایک روز گھر میں نمک نہ تھا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ نے اپنے مرشد کی خاطر ایک درم کا نمک بقال سے اودھار لے لیا اور دلیہ پکا کر مرشد کے پاس لے گئے، جب انھوں نے کھانے کے لیے پیالہ ہاتھ میں ڈالا تو ہاتھ میں گرانی محسوس ہوئی اور فرمایا کہ اس سے اسراف کی بو آتی ہے اور پوچھا کہ نمک کہاں سے لاکر ڈالا گیا ہے، حضرت نظام الدین اولیارؒ نے عرض کیا کہ قرض کا ہے، یہ سن کر فرمایا کہ درویشوں کو فاقہ سے موت آجائے تو اس سے بہتر ہے کہ لذت نفسانی کے لیے وہ مقروض ہوں، قرض اور توکل میں بعد المشرقین ہے، اگر کسی مقروض درویش کو اچانک موت آجائے، تو قیامت میں اس کی گردن قرض کے بار سے جھکی رہے گی، یہ کہکر پیالہ کو غربار میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا، ایک بار تین دن تک کچھ نہ کھایا، تیسرے روز ایک شخص چند روٹیاں لیکر حاضر ہوا، اس کو رزق غیب سمجھکر کھا لیا، مگر فوراً ہی کراہت محسوس ہوئی اور اسی وقت قے کردی معلوم ہوا کہ جو شخص کھانا دے گیا تھا وہ شرابی تھا،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کے زمانہ میں ایک جیتل میں دو سیر آٹا ملتا تھا، لیکن پھر بھی شروع زندگی میں ان کے پاس اتنے دام نہ ہوتے تھے کہ روٹی کے لیے آٹا خرید سکیں، کئی کئی روز کا فاقہ ہو جاتا، ایک بار مسلسل تین روز کا فاقہ ہو گیا تو کسی نے دروازہ پر دستک دی، اور ایک شخص خشک کھچڑی دے کر غائب ہو گیا، حضرت خواجہ نے بھوک کی شدت میں اس کو کھا لیا، اور اس کو کھا کر جو لذت

Marfat.com

محسوس کی اس کا ذکر آیندہ بار بار فرماتے اور کہتے تھے کہ پھر کسی کھانے میں ایسی حلاوت محسوس نہیں ہوئی، جب گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی تو ان کی والدہ ماجدہ کہا کرتیں کہ آج ہم لوگ خداوند تعالےٰ کے مہمان ہیں، حضرت خواجہ کو اس جملہ سے بڑی لذت ملتی، اور جب ان کے گھر میں آذوقہ ہوتا تو وہ افسوس کرتے کہ ان کی والدہ ماجدہ کی زبان پر وہ جملہ نہ ہوگا،

بعض سلاطین و امرار کے غیظ و غضب اور غصہ و کینہ پروری کی بہت بری مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سلطان ناصرالدین محمود کے عہد میں عمادالدین ریحان، سنقار اور انغ خان میں بڑی معاصرانہ چشمک رہی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اور حصول اقتدار کی خاطر فوجیں جمع کرکے میدان جنگ میں بھی اتر آتے تھے، بلبن کے عہد میں لکھنوتی میں طغرل نے بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کرکے اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں کو تہ تیغ کیا گیا، اور ان کے سروں کو سر بازار لٹکا کر وہاں کے لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی گئی، علاءالدین خلجی تخت نشین ہوا تو اس نے جلال الدین خلجی کے شہزادوں ارکلی خاں، ابراہیم اور ان کی ماں کے خلاف تیس چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار انغ خان اور ظفر خاں کی نگرانی میں ملتان بھیجا، جنھوں نے دونوں شہزادوں اور ان کی ماں کو گرفتار کیا، پھر دونوں شہزادے نابینا کردیے گئے، اور ماں قید خانہ میں ڈال دی گئی، ظفر خاں عہد علائی کا بہت ہی بہادر فوجی زنما تھا، اسی وجہ سے دربار کے اور امرار اس سے حسد کرتے تھے، وہ تاتاریوں کے خلاف لڑتا ہوا محض اس لیے مارا گیا کہ باہمی چشمک میں اور فوجی امرا اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، علاءالدین خلجی رنتھنبور کی مہم میں جارہا تھا تو تلپت کے پاس اس کے بھتیجے اکت خان نے

اس پر قاتلانہ حملہ کیا اور وہ ہلاک ہوتے ہوتے بچا، اس نے اشتعال میں آکر اکت خاں اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کرادیا، وہ رنتھنبور ہی کی مہم میں تھا کہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر فخر الدین کوتوال کے لڑکے حاجی مولہ نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور ایک سید کو تخت پر بٹھایا، علاء الدین خلجی نے اپنے فوجی سرداروں کو بھیجکر یہ بغاوت فرو کرائی، حاجی مولہ اور سید کے ساتھ فخر الدین کوتوال کے اور لڑکے بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے،

اسی زمانہ میں صوفیۂ کرام نے حلم و بردباری کے جو نمونے پیش کیے، وہ اپنی مثال آپ ہیں، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ایک روز اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ دلق پوش قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور ان سے مالی مدد کی خواستگار ہوئی انھوں نے اس جماعت سے بیزاری کا اظہار فرمایا، اس پر قلندروں نے گستاخی شروع کر دی اور اینٹ پتھر سے ان کو مارنے لگے، حضرت بہاء الدینؒ نے خادم سے فرمایا کہ خانقاہ کا دروازہ بند کر دو، جب دروازہ بند ہوگیا تو قلندروں نے دروازے پر پتھر مارنے شروع کیے، حضرت بہاء الدینؒ نے کچھ تامل کرنے کے بعد خادم سے فرمایا دروازہ کھول دو، میں اس جگہ بٹھایا گیا ہوں، خود سے نہیں بیٹھا ہوں، خادم نے دروازہ کھول دیا، اس وقت قلندر نادم ہوئے اور اپنے قصور کی معافی چاہی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، غیاث پور کے قریب کا رہنے والا ایک شخص چھجو نامی بلا وجہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا دشمن ہوگیا تھا، اور ایذا رسانی پر کمربستہ رہتا تھا، لیکن جب اس کی وفات کی خبر ان کو ملی تو اس کے جنازہ میں شریک ہوئے اور تدفین کے بعد اس کی قبر پر دوگانہ نماز ادا کی، اور اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کیں، اگر ان کو کسی پر غصہ آتا،

Marfat.com

تو نہ صرف غصہ کو پی جاتے بلکہ اس کو معاف بھی کر دیتے، اور فرماتے کہ جو شخص غصہ پی جاتا ہے اور معاف نہیں کرتا ہے، تو ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ پکڑ لے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار ایک شخص حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے پاس آیا، اور ان کو گالیاں دینے لگا، وہ خاموشی سے سنتے رہے، پھر اس نے جو کچھ مطالبہ کیا پورا کر دیا، اور جب وہ چلا گیا تو حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ ایک شخص ایک مرتبہ بابا فرید کے پاس آیا، اور گستاخانہ طور پر کہنے لگا تو نے اپنے کو بت بنا لیا ہے، بابا فرید نے نرمی سے جواب دیا کہ میں نے اپنے کو نہیں بنایا ہے خداوند تعالیٰ نے مجھکو بنایا ہے، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ کسی کو برا کہنا برا ہے، لیکن برا چاہنا اس سے بھی برا ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ایک شخص سے دوسروں کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان تو ایسا شخص جماد کہلاتا ہے، لیکن ایسے شخص سے وہ شخص بہتر ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا ہے، لیکن ان دونوں سے وہ شخص بہتر ہے کہ اس سے دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے، لیکن لوگ اس کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں پھر بھی وہ تحمل اور حلم سے کام لیتا ہے، یہ کام صدیقوں کا ہے،

درباری سازشوں سے سلاطین اور امراء جتنے قتل ہوئے، ان کی گنتی ممکن نہیں، مملوک سلاطین میں آرام شاہ، سلطانہ رضیہ، بہرام شاہ، خلجی حکمرانوں میں جلال الدین خلجی، قطب الدین مبارک خلجی، اور اس خاندان کا غاصب خسرو خان، تغلق خاندان میں سلطان ابوبکر شاہ، اور خاندان سادات میں معز الدین مبارک شاہ، اور لودیوں میں ابراہیم لودی تہ تیغ ہوئے، اور پھر باہمی کینہ پروری، بغض اور حسد کی وجہ سے سلاطین دہلی کے عہد میں ملک اختیار الدین اتگین، ملک التونیہ، امیر سنقار،

ملک طغرل، ملک اکت خاں، ظفر خاں اور ملک کافور وغیرہ جیسے جلیل القدر امرا بھی نذر شمشیر ہوئے،

لیکن اسی عہد میں صوفیہ کرام نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا، وہ انسانی تاریخ کی عجیب و غریب مثالیں ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں ایک بد باطن شخص ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا، لیکن انھوں نے نور باطن سے یہ معلوم کر لیا اور اس کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اس کو پورا کرو، یہ سن کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا، اور اس نے کہا کہ مجھکو لالچ دیکر آپ کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، خواجہ صاحب نے اس کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ ہم درویشوں کا شیوہ ہے کہ ہم سے کوئی بدی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں،

ایک روز حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نماز ظہر کے بعد جماعت خانہ میں آکر اپنے حجرۂ خاص میں مشغول تھے کہ ایک قلندر تراب نامی وہاں پہنچا، اور ان پر چھری سے پے در پے حملے کیے، خون حجرے کے باہر بہنے لگا، لیکن ان کے استغراق میں فرق نہیں آیا، خون دیکھ کر مریدین حجرے میں گئے اور قلندر کو سزا دینی چاہی، لیکن حضرت چراغ دہلویؒ نے روکا اور اپنے مریدین خاص کو پاس بلا کر قسم دی کہ کوئی شخص قلندر کو ایذا نہ پہنچائے، پھر قلندر سے معذرت کی کہ اگر چھریاں مارتے وقت تمھارے ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو تو معاف کرنا، اور بیس تنکے زر دے کر اسکو رخصت کیا،

حُبِّ جاہ اور حرصِ اقتدار کی خاطر امرا نے بڑے بڑے نمونے پیش کیے، دہلی کی سلطنت کی تاسیس کے چار سال کے اندر قطب الدین ایبک کی وفات ہو گئی،

تو ناصر الدین قباچہ نے ملتان پر قبضہ کر لیا، بنگال میں علی مردان خلجی نے دہلی کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے روگردانی کی، بدایوں کے لوگ ایلتمش کے ساتھ ہو گئے، اسی طرح التتمش کی وفات کے بعد سندھ اور اچہ پر سیف الدین قرنع حملہ آور ہو گیا، اودھ میں بغاوت ہو گئی، بنگال، بہار، ملتان مرکز سے منقطع ہو گئے، امراء کی بغاوتوں کو سر کرنے میں سلاطین کی فوجی، مالی اور دماغی قوتیں برابر صرف ہوتی رہیں، لیکن اسی زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مریدوں کو یہ تعلیم دے رہے تھے، کہ عارف صادق وہ ہے کہ اس کی ملک میں کچھ نہ ہو، اور نہ وہ کسی کی ملک ہو، عارف کا ایثار بے نیازی ہے، عارف وہ نہیں ہے جو کسی چیز کے پیچھے پریشان ہو، حضرت بختیار کاکیؒ نے دنیا کی آلائشوں سے دور رہنے کی تلقین یہ بتا کر دی کہ حضرت بایزید بسطامی نے ستر سال تک عبادت کی، مگر جب مقام قرب آیا تو ان کو قربت محض اس وجہ سے حاصل نہ ہو سکی کہ ان کے پاس دنیاوی آلائشوں میں مٹی کا ایک کوزہ اور چمڑے کا ایک خرقہ باقی رہ گیا تھا، ان کو پھینک دیا، تو یہ درجہ حاصل ہوا، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ فرماتے تھے کہ سالک کو رزق حاصل کرنے کے لیے بھی پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے، اگر وہ اس کیلئے پریشان رہتا ہے تو وہ بد دین اور بد دیانت ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے فقر و فاقہ کی خبر جلال الدین خلجی کو ہوئی تو اس نے ان کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ حکم دیں تو ان کے خدمت گزاروں کے لیے کچھ گاؤں نذر کیے جائیں، مگر حضرت خواجہ کے فاقہ مست جان نثاروں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے یہاں ہم کبھی کبھی روٹی کھا لیتے ہیں، لیکن یہ گاؤں قبول کر لیے گئے تو اس کے بعد ہم آپ کے یہاں پانی پینا بھی پسند نہ کریں گے، یہ جواب سن کر حضرت خواجہ

Marfat.com

بے حد محظوظ ہوئے، قاضی محی الدین کاشانی حضرت خواجہ کے بڑے ممتاز مرید تھے، ان کے پاس ایک جاگیر کا شاہی فرمان تھا، لیکن جب حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو اپنی جاگیر کا شاہی فرمان مرشد کے سامنے لاکر چاک کر دیا، اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے،

سلاطین و امراء جب دنیاوی آلائشوں میں مبتلا ہو کر جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے، تو اس وقت یہی بزرگان دین رضا و تسلیم، صبر و شکر، توکل و قناعت اور ذکر و فکر کے ذریعہ تزکیۂ نفس، تصفیۂ دل اور تجلیۂ روح میں لگے ہوئے تھے، جن کو حاصل کرنے کے بعد وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے، اور ان کی حکومت سلاطین کی حکومت سے زیادہ مقبول ہوتی، وہ فوجوں کے بجائے دلوں کو ٹکرا کر ان میں ایک طوفان بپا کر دیتے جس سے لوگوں کے کردار میں صفائی، اخلاق میں پاکیزگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی رہتی، اور ان ہی خوبیوں سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار بنتا اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان ہندوستان میں اگر مجموعی حیثیت سے اچھے اخلاق اور مستحکم کردار کا ثبوت نہ دیتے، تو شاید اس زمین میں جڑ نہ پکڑ سکتے تھے، بلکہ اور قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں میں ضم ہو جاتے، کردار و اخلاق کو سنوارنے کے لیے اسلام کی باضابطہ تعلیم ضرور تھی، لیکن ان کے عملی نمونے ہندوستان میں صوفیہ اور صلحا پیش کرتے رہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شروع میں ان ہی بزرگان دین کے فقر سے مسلمانوں میں اخلاق کے اسرار جہانگیری واضح ہوتے رہے، ان ہی بزرگوں کی قلندری سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں سیرت کی تونگری حاصل ہوتی رہی، اور ان ہی کی درویشی سے مسلمانوں کے کردار کی سکندری کی راہ کھلی،

اخلاق و کردار کے معمار | شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا

Marfat.com

سیاسی اقتدار شروع ہوا، تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وجہ سے ہندوستان ان کے مختلف قسم کے برکات سے مستفیض ہوا، انھوں نے صوری و معنوی اخلاق کے محاسن کی اسلامی تعلیم اپنے کردار و سیرت کے عملی نمونے سے کچھ اس طرح پیش کی کہ یہاں کے غیر مسلموں کو بھی اسلام کے جلوے ان ہی میں نظر آنے لگے، اور انھوں نے اس سرزمین میں اسلام کے نور کو اس طرح پھیلایا کہ وہ "وارث النبی فی الہند" کے لقب سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان کی نظر جس فاسق پر پڑ جاتی وہ تائب ہو جاتا اور پھر کبھی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہوتا، اور ان ہی کی نظر کیمیا اثر کی وجہ سے ان کے خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جو محض اپنے بلند اخلاق اور پاکیزہ صفات کی وجہ سے لوگوں پر حکومت کرتی رہی، اور جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو یہ بوریا نشین مختلف مقامات پر پہنچ کر دلوں کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، حضرت خواجہ کے اکابر خلفاء میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی روحانی راجدھانی دہلی تھی، شیخ حمید الدین سوالیؒ نے ناگور میں قیام کر کے اس کو اپنے روحانی جلووں سے معمور کیا، دوسرے خلفاء میں شیخ وجیہ الدین، خواجہ برہان الدین شیخ صدر الدین کرمانی، شیخ محمد ترک نارنولی، شیخ علی سنجری اور خواجہ یادگار سبزواری نے مختلف جگہوں میں جا کر لوگوں کے اخلاق و سیرت کو سنوارا اور اسلام کی شوکت قائم کی، مورخوں اور تذکرہ نگاروں دونوں کا بیان ہے کہ التمش کے عہد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت حمید الدین ناگوری، شیخ علی سجزیؒ، شیخ احمد نہروالی۔ شیخ بدر الدین سمرقندیؒ سید قطب الدین غزنویؒ، حضرت نظام الدین ابو المؤید غزنوی، اور شیخ محمود موئنہ وغیرہ کی برکتوں سے اس عہد کے لوگوں میں

Marfat.com

خدا ترسی، تقوی، تزکیۂ نفس، عبادت اور ریاضت کا غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا البلبن
کے عہد میں اتنے مشائخ اور سادات جمع ہو گئے تھے کہ مورخوں نے ان کے وجود کی
وجہ سے اس عہد کو خیر الاعصار لکھا ہے، حضرت بابا گنج شکرؒ، خواجہ علی چشتیؒ، شیخ
بہار الدین زکریا ملتانیؒ، ان کے صاحبزادے شیخ صدر الدینؒ، سیدی مولہ، شیخ
حسام الدین ملتانیؒ، شیخ نجیب الدین فردوسیؒ، شیخ ابو بکر حیدر طوسیؒ وغیرہ کے
انوار سے پوری سلطنت منور ہو گئی تھی،

علار الدین خلجی کے عہد میں علمار کے اجتماع سے دہلی قبۂ اسلام اور رشک مکہ
ومدینہ ہو گئی تھی، تو صوفیۂ کرام کے وجود سے بھی یہ شہر آراستہ تھا، مولانا ضیار الدین برنی
کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ حضرت علار الدین
چشتیؒ اور حضرت رکن الدین سہروردیؒ کے انفاس متبرکہ سے ایک دنیا روشن
ہو گئی تھی، گناہ گاروں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر گناہوں سے توبہ کی، بدکاروں نے
بدکاری سے ہاتھ اٹھایا، اور ان دینی بادشاہوں کی محبت اور اخلاق کے اثر سے
خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی، ان بزرگوں کے وجود سے شعائر
اسلام اور احکام شریعت کو بہت فروغ ہوا اور طریقت نے بڑی رونق پائی،

مولانا ضیار الدین برنی یہ بھی لکھتے ہیں کہ کتنا عجیب زمانہ وہ تھا جو سلطان
علار الدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا، ایک طرف سے سلطان علار الدین نے
ملک کی بہتری کے لیے تمام نشہ آور اور ممنوع چیزوں اور فسق و فجور کے اسباب کو
قہر و غلبہ، تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا، مالداروں سے ان کی سودخواری
ذخیرہ اندوزی اور بغاوت کو ختم کر دیا، پھر بازار والوں کو جو سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں

سچ بولنے پر مجبور کیا، دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین اولیاءؒ بیعت کا عام دروازہ کھول کر خاص وعام، غریب و دولتمند، عالم وجاہل، شہری و دیہاتی سب کو پاکی کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی وجہ سے مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرنے لگے تھے، خواص وعوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہد علائی کے آخری چند برسوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا اور فحاشی وغیرہ کا نام لوگوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، وغیرہ وغیرہ

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا زمانہ محمد تغلق کی حکومت کے ابتدائی دور تک رہا، محمد تغلق ان سے کسب فیض تو نہ کر سکا، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، وہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین کا مرید تھا، اس کے بارے میں عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے مشائخ کو ایذائیں پہنچایا کرتا تھا جیسا کہ آگے بیان ہوگا، لیکن اس کے عہد میں حضرت فخر الدین زرادیؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے عوام و خواص کو بڑا فیض پہنچا، یہی بزرگ فیروز شاہی عہد میں بھی رہے، ان کے علاوہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا اثر فیروز شاہ پر بہت تھا، ان بزرگوں کے اثرات کی وجہ سے شریعت کے احیاء اور بدعات کی روک تھام میں بڑی مدد ملی، بیت المال میں غیر مشروع اور حرام مال روک دیا گیا، محل کے اندر دیواروں پر مصوری اور نقاشی ختم کر دی گئی، چاندی اور سونے کے ظروف کا استعمال بند کر دیا گیا، ممالک محروسہ میں جو باتیں خلاف شرع نظر آئیں قطعاً موقوف کر دی گئیں،

عجیب توارد	اور یہ عجیب توارد ہے کہ خواجگان چشت کا سلسلۃ الذہب حضرت خواجہ

Marfat.com

نصیر الدینؒ کی ذات پر ختم ہوا، تو سلاطین دہلی کا عروج بھی فیروز شاہ تغلق کے ساتھ جاتا رہا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مرض الموت میں مولانا زین الدین علی نے عرض کیا کہ آپ کے اکثر مرید اہل کمال ہیں، کسی کو سجادہ نشین مقرر فرمائیں، تاکہ سلسلہ جاری رہے فرمایا ان درویشوں کے نام لکھ کر لاؤ جن کو تم اس لائق سمجھتے ہو، مولانا زین الدین نے تین قسم کے درویشوں کا انتخاب کیا، اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ، حضرت خواجہ نے ان کے نام کو دیکھ کر فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کا غم کھائیں گے، لیکن دوسروں کا بار نہ اٹھا سکیں گے، اس کے بعد وصیت فرمائی کہ دفن کرتے وقت حضرت شیخ نظام الدینؒ کا خرقہ مبارک، عصا، تسبیح، کاسہ اور چوبیں نعلین ان کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے جائیں، اور ایسا ہی کیا گیا،

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بعد حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ، شیخ عبد العزیز چشتی دہلویؒ، شیخ سلیم چشتیؒ، شیخ دانیال چشتیؒ، شیخ علاء الدین مجذوبؒ، شیخ اجودھن جونپوریؒ سید علاء الدین مجذوبؒ نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تعلیم تو جاری رکھی لیکن وہ اپنے پیش رو بزرگوں کی طرح ایک غیر معمولی روحانی طاقت بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر نہ چھا سکے، گو الیاس سے شطاریہ سلسلہ چلا، اور خود دہلی میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور ان کے خلفاء کے ذریعہ نقشبندیہ سلسلہ کی تعلیمات کی ترویج ہوئی، لیکن عہد اکبری کے آتے آتے تصوف میں اتنی خرابیاں پیدا ہو گئیں کہ اس کے ذریعہ سے پہلے کی طرح روحانی تربیت و اصلاح کا کام خاطر خواہ طریقہ پر نہ ہو سکا،

Marfat.com

خام صوفیہ | یہ خرابیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ حضرت بختیار کاکیؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ جیسے جلیل القدر صوفیہ پیدا نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر خام صوفیہ پیدا ہونے لگے، اور وہ تصوف کی روح سے بیگانہ ہو کر اس کے ظاہری رسوم پر زیادہ زور دینے لگے، اور جب وحدت الوجود کے مسئلہ میں زیادہ گرماگرمی پیدا ہوئی تو وہ اس کے اصلی رموز کو تو سمجھ نہ سکے، اتحاد و حلول کی ظاہری باتوں میں بہہ کر گمراہ ہو گئے، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، اسی طرح وہ اپنے سلسلہ کے بزرگوں کی اصلی تعلیمات کو بھلا کر صرف ان کے کشف و کرامات ہی کو تصوف قرار دیتے رہے، وہ سنت و شریعت کو بھول کر غیر شرعی ریاضات و مجاہدات اور غیر اسلامی احوال و مواجید کے قائل رہے، نماز روزے کو باطن کی درستگی کے بعد غیر اہم قرار دیا، سماع کی اصلی حقیقت کو نظر انداز کر کے نغمہ اور رقص پر زیادہ زور دینے لگے، پھر کبیر، رامانند، اور چیتن وغیرہ کی جو روحانی تحریکیں اٹھیں، تو ایک گروہ اس کا بھی قائل ہو گیا کہ رام اور رحیم دونوں ایک ہیں، دنیا کا مالک ایک ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض اخلاص، محبت اور تلاش کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں ہے، خالق مخلوق میں ہے، اور مخلوق خالق میں ہے، یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں، یہ تحریکیں کچھ ایسی دل آویز تھیں کہ ان میں کچھ مسلمان بھی شریک ہو گئے،

حضرت مجددؒ کی اصلاحی کوششیں | حضرت مجددؒ نے اسی قسم کی تمام باتوں کو بدعت قرار دیا اور مسلمانوں میں ان بدعتوں کے خلاف تجدیدی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کیا جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اور ایسے احوال و کیفیات کو جو نامشروع طریقہ پر مترتب ہوں استدراج کہا انھوں نے کسی چیز کی حلت یا حرمت کے سلسلہ میں اولیائے کرام کے الہام کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کیا،

اسی طرح ارباب باطن کے کشف کو کسی چیز کے فرض یا سنت ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا اور صاف طور پر بتایا کہ علوم لدنیہ کی صحت و مقبولیت کی علامت یہ ہے کہ علوم شرعیہ کے ساتھ ان کی مطابقت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے، الحاد اور بے دینی ہے، سنت سے ہٹ کر جو ریاضتیں کی جاتی ہیں، وہ صریحاً گمراہی ہے، وہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو کوئی جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور ہوتا جائے گا، کیونکہ نفس کے لیے شریعت کے اوامر و نواہی کے بجالانے سے زیادہ دشوار کوئی اور چیز نہیں، اور صاحب شریعت کی پیروی کے بعد کسی خرابی کا تصور نہیں آسکتا، اسی لیے وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کیے جائیں وہ معتبر نہیں ہیں، وہ اپنے ایک مکتوب میں شیخ نظام تھانیسری کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس طرح آپ کی مجلس میں تصوف کی کتابوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح فقہ کی کتابوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے، اور اگر تصوف کی کتابیں نہ پڑھی جائیں تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ احوال سے تعلق رکھتی ہیں، اور قال میں نہیں آتیں، لیکن کتب فقہ کے نہ پڑھنے پر ضرر کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال متابعت عطا فرمائے۔ وہ خام صوفیوں کے سماع و نغمہ اور وجد و تواجد کی بھی مذمت کرتے رہے، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔

حضرت مجددؒ نے جس طرح دین کی تجدید کی، اور اکبر کے دین الٰہی کے فتنوں کا سد باب اپنے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے کیا، اسی طرح تصوف کی بھی تجدید کی، جس کو ان کے صاحبزادوں میں خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید اور عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم، اور خلفاء میں میر محمد نعمان کشمی، مولانا محمد ہاشم کشمی، خواجہ سید آدم بنوری حسینی،

شیخ طاہر لاہوری، شیخ بدیع الدین سہارنپوری، شیخ نور محمد پٹنی، شیخ حمید بنگالی، شیخ طاہر بدخشی، مولانا یوسف سمرقندی، مولانا احمد برکی، مولانا محمد صالح کولابی، سید محب اللہ مانکپوریؒ، حاجی خضر افغان، شیخ بابا حسن ابدالی، مولانا امان اللہ لاہوری، وغیرہ نے اپنی کوششوں سے برقرار رکھا، ادیب اب علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان ہی کے فیوض وبرکات کی وجہ سے شاہ جہاں اور عالمگیر جہانگیر اور اکبر سے بالکل مختلف حکمراں گذرے،

صوفیہ کا فقدان اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ عالمگیر کے بعد جس طرح اچھے علماء کا پیدا ہونا بند ہوگیا، اسی طرح اچھے صوفیہ کا بھی فقدان ہوگیا، یہاں تک کہ میر محمد حسین رضوی مشہدی جو اپنے کو فرلود نمود اللہ کہتا تھا، قبلہ حاجات اور گہوارہ سعادت سمجھا جانے لگا، اور تصوف بازیِ بچگان بن گیا، شاہ عبد العزیز کے ملفوظات میں ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں ہر سلسلہ اور طریقہ کے بائیس بزرگ صاحبِ ارشاد دہلی میں موجود تھے، ان ہی میں مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت فخر الدین دہلوی بھی تھے، ان سے پیاس بجھ تو جاتی تھی، لیکن ان میں ان کے اکابر اسلاف کی روح نہیں تھی، اور پھر صوفیۂ خام کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ یہ خود بھی گمراہیوں میں مبتلا رہے، اور اس زمانہ کے مسلمانوں کو بھی مبتلا کیا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا،

سلاطین ومشائخ کا تصادم سلاطین وصوفیہ کی زندگی کی نوعیت میں جو بعد المشرقین رہا، اس لحاظ سے دونوں میں یگانگت پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، لیکن صوفیہ کرام کی یہ کرامت تھی کہ وہ ہر دور میں سلاطین کو اپنے آستانوں پر جھکاتے رہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ علماء تو سلاطین سے مذہبی، فقہی مسائل اور طرز حکومت کی نوعیت پر

Marfat.com

بہت الجھے. لیکن صوفیہ کرام نے ان سے الجھنے کے بجائے ان کو اپنے سے قریب کر دیا،
کچھ ایسے سلاطین بھی گزرے ہیں جن کا تصادم ان کے بعض معاصر مشائخ سے ہوا،
لیکن ان کی مثالیں بہت زیادہ نہیں ہیں، اس تصادم کا جائزہ لینے سے پہلے ایک بات
کی وضاحت ضروری ہے، اور وہ یہ کہ تذکرہ نگار جب بوریا نشینوں اور تخت نشینوں
کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ کچھ نہ کچھ ایسی باتیں تخت نشینوں کے متعلق ضرور قلمبند
کر دیتے ہیں جن سے ان کے خیال میں درویشی کی عظمت اور جلالت بڑھ جاتی ہے،
لیکن تنقید و تجزیہ کے بعد ان کے بیانات میں بڑی کمزوری دکھائی دیتی ہے اگر کچھ
مورخین ایسے بھی ہیں جو ان تذکرہ نویسوں کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر سلاطین
کے کردار کو اس طرح پیش کرنے لگے جن سے وہ خواہ مخواہ بدنام ہو جاتے ہیں لیکن
اسی کے ساتھ کچھ درباری مورخین ایسے بھی ہیں جو اپنے شاہی آقاؤں کا حق نمک
ادا کرنے کی خاطر مشائخ کی اچھی تصویر نہیں کھینچے ہیں، اس طرح تذکرہ نگاروں
اور مورخوں دونوں کی غیر دارانہ تحریروں سے اس عہد کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے،
اسی لیے، ان اختلافات میں دونوں کے بیانات کو قبول اور رد کرنے میں بڑی احتیاط
کی ضرورت ہے،

سلاطین اور صوفیہ کے اختلافات کی پہلی مثال سلطان جلال الدین خلجی اور
اور سیدی مولہ کے تصادم میں ملتی ہے، مولانا ضیاءالدین برنی لکھتے ہیں، سیدی مولہ
عجیب غریب بزرگ تھے، نماز کے پابند تھے، لیکن جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے
تھے، کوئی کچھ دیتا تو اس کو قبول نہ کرتے، لیکن ان کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو
حیرت ہوتی تھی، کہ وہ اخراجات پورا کرنے کے لیے روپے کہاں سے لاتے ہیں،

Marfat.com

لوگ کہتے کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں، ان کی خانقاہ میں روزآنہ ہزاروں من میدہ خرچ ہوتا تھا، پانچ سو جانور ذبح کیے جاتے تھے، دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات خریدی جاتی تھی، ان کے یہاں امرار کی آمد ورفت برابر رہتی، اور ایسے امرار نے جو سلطان جلال الدین خلجی سے بدظن تھے، اس خانقاہ میں بیٹھکر یہ سازش کرنی چاہی کہ سلطان جلال الدین خلجی کی بجائے سید مولہ کو حکمراں بنایا جائے، اس کی خبر سلطان کو ہوئی، تو سیدی مولہ اور ان بدباطن امرار کو اپنے سامنے بلایا، انھوں نے اپنے جرم سے انکار کیا، تو سلطان نے چاہا کہ اس زمانے کے رسم کے مطابق ان کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ اگر وہ سچے ہوئے تو بچ جائیں گے، اور جھوٹے ہوئے تو ہلاک ہو جائیں گے، علمار نے اس کی مخالفت کی کہ آگ کے ذریعہ سے جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی ہے، اور یہ فعل نامشروع ہے، سلطان نے یہ ارادہ ترک کر دیا، اور سیدی مولہ کو بندھوا کر اپنے محل کے پاس بلوایا اور ان سے مباحثہ کیا، اور جب بحث جاری تھی تو حیدری جماعت کے ایک فرد نے بڑھ کر سیدی مولہ کو استرے سے زخمی کر دیا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے ارکلی خان کے اشارہ سے ایک فیل بان ہاتھی لیکر دوڑا، اور سیدی مولہ کو ہاتھی کے پاؤں سے مسل ڈالا، مولانا ضیار الدین برنی نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی جیسے حلیم اور بردبار بادشاہ کی وجہ سے درویشی کی عزت جاتی رہی، لیکن جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، اس روز اتنی زبردست آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے، جلال الدین خلجی نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس سے ایک غلط کام ہو گیا ہے، یہ تصادم ذاتی اشتعال یا سیاسی مصالح کی بنا پر ہوا، اس میں اصولی اختلاف نہ تھا،

Marfat.com

البتہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی سلطان وقت سے نہ ملیں گے، اس سلسلہ میں بعض سلاطین سے ان کا شدید اختلاف رہا، سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ کے شرف ملاقات کی بڑی تمنا تھی، لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی، اس کے دربار سے امیر خسرو وابستہ تھے اس لیے بھیس بدل کر امیر خسرو کے ساتھ حضرت خواجہ کا دیدار حاصل کرنا چاہا، امیر خسرو بھی اس کے لیے راضی ہوگئے، لیکن یکایک ان کو خیال ہوا کہ اپنے دنیاوی آقا کو خوش کرنے میں کہیں ان کے روحانی آقا ناخوش نہ ہوجائیں، اس لیے اپنے مرشد سے سلطان کے ارادہ کو ظاہر کر دیا، حضرت خواجہ کو یہ معلوم ہوا تو اسی وقت شہر چھوڑ کر اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کے لیے اجودھن روانہ ہوگئے، سلطان جلال الدین کو خبر ملی تو امیر خسرو سے یہ راز فاش کرنے کی بازپرس کی، امیر خسرو نے بڑی جرأت کے ساتھ سلطان کو جواب دیا کہ آپ رنجیدہ ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ ہے، سلطان یہ جواب سنکر خاموش ہوگیا۔

سلطان علاء الدین خلجی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے پاس نذریں بھیجتا، ان سے اپنی فوجی مہم کی کامیابی کے لیے دعاؤں کا طلبگار رہتا، ان کی مجلس سماع کا ذکر شوق سے سنتا، لیکن اس حسن عقیدت کے باوجود دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور جب اس سے حضرت خواجہ سے ملنے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ ہوکر سر سے پاؤں تک گناہوں میں آلودہ ہوں، اس آلودگی وجہ سے ایسے پاک بزرگ سے ملنے میں شرم آتی ہے، عوام و خواص میں حضرت خواجہ کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تو علاء الدین خلجی کو سلطان وقت کی

Marfat.com

حیثیت سے ایک موقع پر رشک پیدا ہوا کہ کہیں وہ اس کے لیے خطرہ نہ بن جائیں، اس لیے ان کو آزمانے کی خاطر لکھ بھیجا کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا کی سلطنت کی باگ ہمارے ہاتھ میں دی ہے، تو ہم کو چاہیے کہ ملک کی بھلائی اور اپنی بہتری کے لیے آپ سے بھی مشورہ کر کے ان پر عمل کرتے رہیں، لیکن حضرت خواجہ کی طرف سے یہ پیام تھا کہ فقیروں کو بادشاہوں کے کام سے کیا مطلب میں ایک فقیر ہوں، اور ایک گوشہ میں رہتا ہوں بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعاگوئی میں مشغول ہوں، اس کے بعد بھی بادشاہ مجھ سے کچھ کہے گا تو میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا، خدا کی زمین کشادہ ہے، سلطان علاء الدین کو یہ پیام پہنچا تو وہ ان کا اور بھی معتقد ہو گیا، اور پھر ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ آنے کی ضرورت نہیں ہے غائبانہ دعا میں مشغول ہوں، اور غائبانہ دعا اثر رکھتی ہے، سلطان نے پھر اصرار کیا تو حضرت خواجہ نے آزردہ ہو کر کہا کہ اس ضعیف کے گھر میں دو دروازے ہیں، اگر بادشاہ ایک دروازہ سے تشریف لائے تو میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا،

سلطان علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا قطب الدین مبارک خلجی ملک کافور کی مدد سے اپنے دو بھائیوں حضر خاں اور شادی خان کو قتل کر کے تخت نشیں ہوا، یہ دونوں شہزادے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے عزیز مریدوں میں تھے، اس لیے سلطان قطب الدین خلجی ان سے بدگمان رہا، اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہو گئی، اور مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہو گیا، اور حضرت خواجہ کی دشمنی کا اظہار کھلم کھلا کرنے لگا اس وقت ان کے لنگر خانہ کا خرچ روزانہ دو ہزار ٹنکہ تھا، سلطان کے بعض

مفسد امراء نے اس کے کان بھرے کہ یہ تمام اخراجات اُن امراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں، جو خانقاہ میں آیا جایا کرتے ہیں، سلطان نے خانقاہ میں امراء کی آمد و رفت سختی سے روک دی، مگر اس لنگر خانہ کے اخراجات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا، اور سارے اخراجات حسب معمول پورے ہوتے رہے، سلطان کی پرخاش اور بڑھی، اور اس نے حضرت خواجہ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا، لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ میں گوشہ میں بیٹھا رہتا ہوں، کہیں آتا جاتا نہیں، میرے بزرگوں کا بھی یہ قاعدہ نہیں تھا کہ وہ دربار میں جائیں، اور بادشاہوں کے مصاحب بنیں، اس لیے مجھکو اس سے معذور سمجھ کر معاف رکھنا چاہیے، لیکن سلطان نے اس عذر کو قبول نہیں کیا، اور غصہ میں آکر یہ اعلان کرادیا کہ جو کوئی بھی ان کا سر لائے گا اس کو ایک ہزار اشرفی انعام میں دیجائے گی، حضرت خواجہ نے سلطان کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہنچانا کسی مذہب میں روا نہیں مگر اس پیام کے پہنچنے سے پہلے شیخ ضیاء الدین رومی کا انتقال ہوگیا، ان کی فاتحہ خوانی کے موقع پر سلطان اور اس کے اکابر امراء ان کے مزار کے پاس جمع ہوئے، تو حضرت خواجہ نے بھی اس میں شرکت کی، جس وقت وہ تشریف لائے تو تمام حاضرین ان کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، سلطان نے یہ دیکھا تو اس کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور محل میں جا کر اس نے حکم جاری کیا کہ ہر قمری مہینہ کی پہلی تاریخ کو جب کہ تمام ائمہ اور مشائخ دربار میں رسماً جمع ہوا کرتے ہیں تو وہ بھی حاضر ہوں،

جب یہ حکم ان کے پاس پہنچا، تو صرف یہ فرمایا کہ دیکھوں گا کہ کیا ظہور میں آتا ہے، شہر کے اکابر نے حضرت خواجہ کی خدمت میں پہنچکر ان سے عرض کیا کہ ایک ناعاقبت اندیش

Marfat.com

سلطان کی وجہ سے کوئی فتنہ پیدا ہو جائے تو دربار میں جاکر اس کو روک دینا بہتر ہے، لیکن حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں اپنے مرشدوں کے خلاف دستور کوئی کام نہ کروں گا، لوگوں میں بڑی سراسیمگی تھی کہ سلطان الاولیا، اور سلطانِ دہلی کے تصادم سے ایک بڑی مصیبت بپا ہو جائے گی، لیکن سلطان قطب الدین جس روز دربار میں حضرت خواجہ کی آمد کا منتظر تھا، اُسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ خسرو خان کے ہاتھوں قتل ہوا،

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ یہ اختلاف بھی کسی نظری اور فکری مسئلہ پر نہ تھا، بلکہ سراسر ذاتی تھا، خسرو خاں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سیہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر مشائخ کے پاس بھی روپیے بھجوائے، حضرت خواجہ کے پاس بھی پانچ لاکھ ٹنکے پہنچے، لیکن انھوں نے اسی وقت ساری رقم فقراء میں تقسیم کر دی، اور جب غیاث الدین تغلق بادشاہ ہوا تو جن لوگوں کو خسرو نے روپے دیے تھے ان سے غیاث الدین تغلق نے واپس مانگے، اس حکم پر دوسرے مشائخ نے روپے واپس کر دیے، لیکن حضرت خواجہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، آگے چل کر غیاث الدین تغلق نے جاہ طلب علماء کے مشورے سے ایک محضر میں حضرت خواجہ کو سماع کے جائز و ناجائز ہونے پر مناظرہ کرنے کے لیے طلب کیا، تو اس میں وہ شریک ہوئے، اور سماع کی اباحت اور حلت میں دلائل پیش کیے، اس کی تفصیل آگے آئے گی، بعض تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین ۷۲۵ھ میں بنگالہ کی مہم سے واپس آرہا تھا تو اس نے حضرت خواجہ کے پاس یہ پیام کہلا بھیجا کہ وہ غیاث پور سے نکل کر اس کا استقبال کریں، لیکن اس پیام کو

Marfat.com

پڑھ کر حضرت خواجہ کی زبان سے صرف یہ نکلا کہ ہنوز دلی دور است، چنانچہ غیاث الدین تغلق شہر سے تین کوس کے فاصلہ پر ایک نئی عمارت میں مقیم تھا کہ اچانک یہ عمارت رات کو گر گئی جس کے نیچے دب کر وہ جاں بحق ہو گیا، لیکن یہ مشہور روایت محض عوام کی ہے، جس کو موجودہ دور کے محققین صحیح تسلیم کرنے کیلیے تیار نہیں،

حضرت خواجہ نے سلاطین وقت سے ملنے سے جو گریز کیا اس سے عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کے خواجگان بادشاہوں کی ملاقات کو دنیاوی نجاست تصور کرتے رہے، اور اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بار سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت رکن الدینؒ دہلی سے سلطان وقت سے مل کر ملتان جا رہے تھے، تو واپسی میں پاک پٹن بھی ٹھہرے اور حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدینؒ سے ملاقات کے وقت معانقہ کیا، تو آخر الذکر نے معانقہ کے بعد غسل فرمایا کہ ان میں بھی درباری نجاست لگ گئی ہے، حضرت رکن الدینؒ نے غسل فرمانے پر ان کی احتیاط کو سراہا اور اپنی ذات سے ندامت کا اظہار کیا،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کا سلاطین سے نہ ملنا ان کی درویشی کے جلوۂ صد رنگ میں سے ایک تابناک جلوہ تھا، لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ یا خواجگانِ چشت بادشاہت کو ایک نجس چیز سمجھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے لیے تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، پھر اوپر یہ بھی ذکر آیا ہے کہ انھوں نے علاء الدین خلجی کو یہ کہلا بھیجا کہ میں بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعا گوئی میں مشغول ہوں، ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان کے

Marfat.com

معیار کے مطابق کوئی سلطان ہوتا، یا وہ اگر سلطان التمش یا ناصر الدین محمود یا غیاث الدین بلبن کے وقت میں ہوتے تو بادشاہ سے ملنے میں پرہیز نہ کرتے، کیونکہ خود ان کے سلسلہ کے اکابر بزرگ بادشاہ سے ملاقات کرنا کوئی دنیاوی نجاست تصور نہیں کرتے تھے، ایک روایت میں ہے کہ التمش نے حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کی صحبت میں رہ کر علم لدنی اور معرفتِ باطن کے تمام رموز حاصل کیے اور اگر یہ روایت تسلیم نہ بھی کی جائے تو مستند تذکروں میں ہے کہ التمش سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جو روحانی لگاؤ تھا اس کی بنا پر وہ ایک بار اجمیر سے چل کر دہلی تشریف لائے، اور سلطان سے ملنے میں تامل نہ کیا، سیر الاولیاء جیسے مستند تذکرہ میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کے صاحبزادوں کے قبضہ میں اجمیر کے پاس ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے لگان مقرر کرنے میں ان کو کچھ زیادہ تنگ کیا تو انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ وہ دہلی جا کر سلطان سے ایک فرمان لے آئیں، حضرت خواجہ نے اپنے صاجزادوں کی خاطر دہلی کا سفر کیا اور جب وہ اپنے مرید حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے پاس پہنچے اور ان کو اپنے مرشد کی تشریف آوری کی وجہ معلوم ہوئی، تو انھوں نے اپنے مرشد کو سلطان کے پاس جانے سے روک دیا، اور خود سلطان کے یہاں قدم رنجہ فرمایا، وہ کبھی سلطان کے پاس نہیں گئے تھے، حالاں کہ سلطان اس کا برابر متمنی رہا، سلطان اپنے مرشد کو اپنے یہاں دیکھ کر متعجب ہوا، اور جو کچھ انھوں نے چاہا اس نے کر دیا، یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ التمش برابر ان کے خلوت وجلوت میں ساتھ رہا، اور رات کے وقت ان کے پاؤں بھی دابا کرتا تھا، فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود اوچہ...

Marfat.com

اور ملتان کی طرف گیا، تو وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے ملا، اور وہ بھی اس سے بڑی خوشی سے ملے، سیر الاولیاء ہی کی روایت ہے کہ بلبن جب سلطان ناصر الدین محمود کا وزیر تھا، تو وہ حضرت گنج شکرؒ سے جا کر ملا تو انھوں نے اس کے بادشاہ ہونے کی پیشین گوئی بھی کی حضرت گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدینؒ ان کے سجادہ نشین ہوئے تو وہ دربار سے الگ تھلگ ضرور رہے، لیکن انھوں نے محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کو مرید بھی کیا، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین خلجی سے ملاقات کرنا تو پسند نہیں کیا، لیکن اس کے لڑکوں میں سے خضر خان اور شادی خان کو مرید کیا، اور یہ دونوں ان کے عزیز مریدوں میں سے تھے، خضر خان ہی نے خانقاہ کی عمارت بنوائی، پھر حضرت خواجہ کے سب سے محبوب مرید حضرت امیر خسرو تھے جو جلال الدین خلجی کے مصحف دار اور بارہ سو تنکے سالانہ کے وظیفہ خوار اور علاء الدین خلجی کے معزز درباری رہے، قطب الدین مبارک خلجی کی شان میں قصیدے بھی کہتے رہے، اور اپنی مثنوی نہ سپہر کے صلہ میں اس سے ہاتھی کے برابر روپے پائے، غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال بھی گئے، اور ان آقاؤں کی فتح و تسخیر پر نثر و نظم میں کتابیں بھی لکھتے رہے۔ لیکن اس دربار داری کے باوجود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو ان سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے سے تو تنگ آجاتا ہوں لیکن امیر خسرو سے کبھی تنگ نہیں ہوتا ہوں، ایک اور موقع پر فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جب پوچھے گا کہ دنیا سے

Marfat.com

کیا لائے، تو میں کہونگا اس ترک اللہ (یعنی امیر خسرو) کا سوز سینہ، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری قبر میں ساتھ دفن کیا جائے، تاکہ قبر کے اندر بھی یکجائی ہو، امیر خسرو کی زندگی کی یہ کرامت ہے کہ وہ سلاطین وقت کے درباری اور ہمجلیس بھی تھے اور خلوت میں اپنے مرشد کے ادنیٰ خادم بھی رہے، لیکن دونوں میں کسی کو بھی اپنے سے آزردہ ہونے کا موقع نہیں دیا، امیر خسرو کے درباری تعلقات قائم رکھنے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کبھی معترض نہیں ہوئے، لیکن اس کی بھی مثال ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے درباری تعلقات رکھنے میں مانع بھی ہوئے، مثلاً خواجہ موید الدین کرہ سلطان علاء الدین کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے جانثاروں میں تھے، مگر ترک دنیا کرکے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر جبین سائی کرنے لگے، علاء الدین خلجی جب بادشاہ ہوا تو ایک حاجب کو حضرت خواجہ کی خدمت میں بھیج کر پیام دیا کہ خواجہ موید الدین کو رخصت کر دیں تاکہ وہ اس کے کام میں مدد دیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کو ایک اور کام درپیش ہے، اور اسی میں وہ کوشش کر رہے ہیں، شاہی حاجب کو یہ جواب گراں گزرا، اور اس نے کہا کہ مخدوم! آپ چاہتے ہیں کہ اپنا جیسا سب کو کر لیں، حضرت خواجہ نے فرمایا اپنے جیسا کیا میں اپنے سے بہتر کرنا چاہتا ہوں، اسی طرح حضرت خواجہ شمس الدین دہاری شاہی ملازمت میں دیوان کے عہدہ پر مامور تھے، مگر اس عہدہ کو چھوڑ کر حضرت خواجہؒ کے مرید ہو گئے، اور ان کے ملفوظات کے کاتب بن گئے، ایک دن حضرت خواجہ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آنے جانے والوں کے لیے ایک مکان بنا لوں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ کام اوس کام سے

Marfat.com

جس کو تم نے چھوڑا ہے کم نہیں ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت فخر الدین زرادیؒ نے اپنے مرشد کے مسلک کے مطابق سلاطین سے ملاقات کرنے میں گریز ضرور کیا، لیکن ان تینوں کی ملاقاتیں سلطان محمد تغلق سے ہوئیں، گو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس پر جبر کر کے اس سے ملاقات کی، حضرت نصیر الدین چراغؒ نے کسی بادشاہ کو اپنے حلقہ ارادت میں تو نہیں لیا، لیکن سلطان فیروز شاہ کا لائق وزیر خانجہاں ان کا مرید تھا، اور وہ اس کے بہت مہربان رہے، اور جب اس نے ان سے عبادت و ریاضت کی تفصیل پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ تم وزیر مملکت ہو، تمھاری عبادت یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو، آگے چل کر چشتیہ سلسلہ کے اکابر صوفیہ میں حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ وغیرہ کی بھی ملاقاتیں سلاطینِ وقت سے ہوتی رہیں، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے علاوہ چشتیہ سلسلہ کے بہت سی بزرگوں نے بادشاہوں سے ملاقاتیں تو کیں لیکن ان میں سے کوئی دربار میں خود سے حاضری دینا پسند نہ کرتا، بادشاہ وقت خود ان کے پاس آجاتے تو وہ ان سے ملاقات کر لیتے، لیکن ان ملاقاتوں کے باوجود سلاطین اور امراء سے تعلقات رکھنا اپنی فقیری اور گمنامی کی شان کے خلاف سمجھتے رہے، ان کے خلا ملا سے راحت پسندی اور تن پروری کا خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لیے کبھی ان کا دیہہ دار یا جاگیر دار بننا پسند نہیں کیا، اور نہ ان کے دفتر میں اپنا نام لکھوانا گوارا کیا، اپنی فقیری کی شانِ کمال استغنا رہی میں تصور

کرتے رہے جس کی تفصیل آگے آئے گی،

محمد بن تغلق اور صوفیہ کا تصادم

پہلے کہا جا چکا ہے کہ محمد بن تغلق حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا، اور ان کی اولادوں کو بڑے عہدوں سے نوازا، اس نے بعض مشائخ کے لیے خانقاہیں بھی بنوائیں، اور بعض کے مزارات بھی تعمیر کرائے اور ان کے لیے جاگیریں وقف کیں، لیکن اسی کے ساتھ بعض تاریخوں اور تذکروں میں ہے کہ اس نے شیخ شہاب الدین بن احمد جام کی داڑھی نچوائی، اور آخر میں ان کے منہ میں گوبر ڈلوا کر ان کو ہلاک کرایا، شیخ ہود کو بھی قتل کرایا، شیخ شمس الدین بن تاج العارفین کو قید کیا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے گلے کی ہڈیوں میں سوراخ کراکے ان کو رسیوں سے باندھنے کا حکم دیا اور ان کو قید کر دیا، اسی طرح اس نے حضرت فخر الدین زرادیؒ اور حضرت قطب الدینؒ منور کو بھی ایذائیں پہنچائیں ان واقعات کی تفصیل لکھ کر سلطان کو جابر، قاہر، سفاک، ظالم اور خونی حکمراں بتایا گیا ہے، اس کے عہد کے ایک شاعر عصامی نے تو اس کو ملحد، بے دین، اصول و فروع سے منحرف وغیرہ وغیرہ قرار دیا ہے، اور یہ بھی الزام رکھا ہے کہ اس کی بے راہ روی کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں کفر پھیلا اور اسلام کی رونق کم ہو گئی، ابن بطوطہ سلطان کے ساتھ ایک عرصۂ دراز تک رہا، اس نے سلطان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ عصامی یا اس کے ہم خیال مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان کی سخاوت، شجاعت، سختی اور خونریزی کی حکایات عوام الناس کے زبان زد ہیں، اس کے باوجود میں نے کسی شخص کو اس سے زیادہ متواضع اور منصف نہیں دیکھا، وہ شریعت کا پابند ہے اور نماز کی بڑی تاکید

کرتا ہے، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا ہے، اور وہ اُن بادشاہوں میں ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی ہے،

موجودہ دور کے محققین اور مورخین بھی محمد بن تغلق کو ان عینکوں سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جن سے اس کے بعض معاصر یا عہد مغلیہ کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے دیکھا ہے اور اس دور میں اس پر جتنے الزامات رکھے گئے تھے، ان کا ناقدانہ اور محققانہ تجزیہ کر کے ان کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے اسی طرح صوفیہ کرام کی خوں ریزی اور ایذارسانی کے بعض واقعات کو بھی من گھڑت داستانیں اور کذب عوام الناس ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ دور کے ایک مورخ جناب آغا مہدی حسین نے اپنی کتاب سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق میں اس کی سیرت کا محققانہ جائزہ لینے کے بعد آخر میں یہ لکھا ہے کہ سلطان محمد کیا تھا، اور بنانے والوں نے اس کو کیا بنا دیا، وہ بیدار مغز روشن ضمیر، صلح پسند. فراخ دل، مصلح، عالی حوصلہ، عالم، عامل، محقق، مجدد، مدبر، فیاض، سیر چشم، محتاط، اور اصول کا پابند تھا وفاداروں اور فرمانبرداروں کا کیا ذکر دشمنوں پر بھی مہربانی کرتا، مجرموں کے جرم کو معاف کر دیتا، اور خطاکاروں کی خطاؤں کو بخش دیتا، چشم پوشی سے بھی کام لیتا، سزائیں بہت دیتا، اور خونریزیاں کرتا، مگر جو کچھ کرتا تھا، کسی خاص مطلب اور مصلحت سے کرتا تھا، بدقسمتی سے اس کا مطلب پورا نہ ہونے پایا، اس نے جاہل نما عالموں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اور بہترین علما، اور مشائخ کو ملکی عہدوں اور ذمہ داریوں پر بلکہ دربار کی مختلف خدمتوں پر مقرر کرنا چاہا تھا، مگر ناکام رہا، دشمنی پھیل گئی، اور مخالفت بڑھ گئی، باغیوں کی بن آئی، اور سلطان محمد کی جان پر

آبنی، آخر وہ ہلاک ہوگیا، اس کے مرتے ہی سلطنت پر اُن علماء کا اثر قائم ہوگیا جن کی اصلاح میں سلطان محمد اتنے عرصہ سے کوشاں تھا، اسی اثر کے تحت میں ایک تحریک ہوئی، جس کی بنا پر سلطان کے ظلم اور اُس کی خونریزیاں باقاعدہ لکھی گئیں،

پروفیسر ایشوری پرشاد نے بھی ان الزامات پر ناقدانہ بحث کی ہے جو سلطان پر بعض معاصر مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے عائد کیے ہیں، اور اس کو ایک غیر معمولی دل و دماغ کا حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جن علماء اور مشائخ کو سلطان نے سزا دی اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ابن بطوطہ نے ان مجرموں کی فہرست دی ہے، جن کو سلطان نے سزا دی، ان میں سات ایسے ہیں، جو علماء کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جو یا تو سلطان کے دشمن تھے، یا غبن اور خیانت میں ماخوذ ہوئے یا باغیانہ سازشوں میں پکڑے گئے شیخ شہاب الدین، فقیہ عفیف الدین کاشانی، شیخ ہود، شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین، شیخ علی حیدری اور دہلی خطیب الخطباء کو سزا اسلیے دی گئی کہ انھوں نے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی کی اور باغیانہ سازشوں میں حصہ لیا، سلطان کی سزائیں سخت ہوتی تھیں، لیکن اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ وہ علماء کے طبقہ سے متنفر تھا، وہ تو انکی صحبت میں برابر شریک ہوتا، انکو اپنے یہاں مدعو کرتا، انکا سرپرست رہا، لیکن اسکے مزاج میں سختی تھی، اور جو کوئی بھی اسکی عدول حکمی کرتا یا اسکی عدل نوازی میں مزاحم ہوتا تو پھر وہ اسکے قصور کو معاف نہیں کرتا، یہ اقتباس اسلیے دیا گیا ہے کہ گذشتہ دور کے مسلمان مورخین کے بیانات کی افراتفری میں پروفیسر ایشوری پرشاد کی رائے قابل غور ہو سکتی ہے۔

فیروز شاہ کا تصادم صوفیہ سے

فیروز شاہ تغلق شریعت کا لحاظ ہر حال میں رکھتا، اور اس نے اس کی پاسبانی کر کے نہ صرف علماء بلکہ صوفیہ کی بے راہ روی کو بھی سختی سے روکا، اس کے عہد میں ایک بزرگ احمد بہاری تھے، جو دہلی میں آکر رہ گئے تھے،

Marfat.com

اُن کے بہت سے مریدین تھے، فیروز شاہ کا بیان فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ ان کے مریدین دہریے تھے، جو احمد بہاری کو خدا سمجھتے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے، اور خود احمد بہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کرتے تھے، اسی لیے فیروز شاہ نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا، اور قید کر دیا، ان کے مریدین کو ادھر ادھر مختلف شہروں میں بھیجکر منتشر کر دیا، ان کے ایک دوست شیخ عز کاکوی بھی تھے، اُن پر بھی شطحیات کا الزام آیا اور علمار کے فتوئی پر ان کو قتل کر دیا گیا، فتوحات فیروز شاہی میں احمد بہاری اور شیخ کاکوی کے قتل کا ذکر نہیں ہے، لیکن حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بہاری اور شیخ کاکوی دونوں قتل کر دیے گیے، جس سے مخدوم الملک کو بڑا دکھ ہوا، وہ دونوں کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا حامل سمجھتے تھے، اور ان کی باتوں کو عالم دیوانگی پر محمول کرتے تھے، اسی لیے ان کو ان دونوں کے قتل کی خبر ملی تو فرمایا کہ جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے اگر وہ آباد رہے، ان کے حامیوں کا خیال ہے کہ فیروز شاہ کے بعد دہلی تیمور کے ہاتھوں جو برباد ہوئی، وہ گویا ان ہی بزرگوں کا خون رنگ لایا تھا

فیروز شاہ کے عہد میں عین الملک ماہرو کے غلام نے صوفی بن کر اپنے مریدوں کو تاکید کی کہ میں انا الحق کہوں تو تم سب بلند آواز سے توئی توئی کہو، اس نے اپنے مریدوں کے لیے ایک رسالہ بھی لکھا، فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ اس کو بھی پابہ زنجیر طلب کر کے سخت سزا دی گئی، فتوحات فیروز شاہی میں اس کے قتل کا بھی ذکر نہیں لیکن وہ بھی علمار کے فتوی پر قتل ہوا،

Marfat.com

فیروز شاہ کے زمانے میں مشائخ کی قبروں کی زیارت کے سلسلہ میں بہت سی بدعتیں بھی پیدا ہوگئی تھیں، ان کو مزارات کی زیارت کے لیے عورتیں، پالکیوں، گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہوکر جاتیں ان کے پیچھے اوباش لگ جاتے، جو طرح طرح کی مذموم حرکتیں کرتے، فیروز شاہ نے عورتوں کو مزاروں پر جانے سے بالکل روک دیا اور اس حکم کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیں،

حضرت مجدد الف ثانی اور جہانگیر، مغل بادشاہوں کے دور میں جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانی کے درمیاں کچھ دنوں ضرور اختلاف رہا، عالمگیر کے عہد میں حضرت سرمد کی شہادت کا المناک حادثہ بھی ضرور پیش آیا، لیکن ان دونوں واقعات کو چھوڑ کر ہر موقع پر مغل حکمراں صوفیہ کرام کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہے،

پہلے ذکر آیا ہے کہ جہانگیر میں بڑی مذہبی حمیت و غیرت تھی، لیکن اسی کے ساتھ اس سے دو قابل اعتراض باتیں سرزد ہوتی رہیں، ایک تو وہ پیالہ کش رہا، دوسرے اسلام کے حکم کے خلاف اس کے حرم میں ایک وقت میں چار سے زیادہ بیگمات رہیں، اور یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں پیالہ کشی اور کثرت ازدواج شاہانہ لوازم میں داخل ہوگئی تھیں، بلبن، فیروز شاہ تغلق اور بابر جیسے دیندار بادشاہوں کی مجلسوں میں بھی کچھ دنوں تک شیشہ و ساغر کا شغل رہا، جہانگیر تو علانیہ شراب نوشی کرتا رہا، بلکہ اپنی طرح شہزادہ خرم کو بھی شراب پینے کے لیے آمادہ کرتا، اپنے دسویں سال جلوس میں ایک موقع پر صاف گوئی سے کام لے کر لکھتا ہے:-

"وہ (یعنی خرم) ۲۴ سال کا ہوگیا تھا، اس کی شادی بھی ہوگئی تھی، اس کے بچے بھی ہوگئے تھے، لیکن اب تک اس نے شراب پی کر اپنے کو آلودہ

Marfat.com

نہیں کیا تھا، آج کے روز وہ وزن کیے جانے والا تھا، (یعنی اس کی سالگرہ تھی)، میں نے اس سے کہا کہ بابا صاحب! تم اولاد والے ہوگئے ہو، بادشاہ اور شہزادے شراب پیا کرتے ہیں، آج تمہارا جشن وزن ہے تو تمہارے ساتھ میں بھی شراب پیتا ہوں، اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے موقع پر نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو، لیکن اعتدال قائم رہے۔"

جہانگیر آخر آخر وقت تک شراب پیتا رہا، لیکن جمعرات، جمعہ کی رات اور اتوار کو نہیں پیتا، جمعرات اس کی تخت نشینی کا دن تھا، جمعہ کی رات کو وہ متبرک رات سمجھتا اور اتوار اکبر کی پیدائش کا دن تھا، اسی طرح اس کے حرم میں چار سے زیادہ بیویاں رہیں، اکبر نے اپنے عہد حکومت میں اس کی چودہ شادیاں رچا کر اپنے سیاسی اغراض پورے کیے، ان میں چھ راجپوت شہزادیوں سے ہوئیں، جہانگیر نے خود اپنے عہد حکومت میں تین نکاح کیے، ممتاز اور با اثر ہندو اور مسلمان منصبداروں نے اپنی اپنی لڑکیوں کو اس کے حرم میں بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ داخل کیا، اور خود راجکماریاں اور امیرزادیاں بھی ملکہ بننے کے شوق میں سوکنوں کا خیال کیے بغیر حرم میں داخل ہوتی رہیں، اسلامی قانون کی یہ خلاف ورزی جس کسی مسلمان حکمران نے کی، اس کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہے،

جہانگیر اپنی ان معصیتوں کے باوجود مذہب کا برابر احترام کرتا رہا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس نے ابوالفضل کا قتل اس لیے کرایا کہ اس کا خیال تھا کہ اسی نے اس کے باپ کو مذہبی گمراہی میں مبتلا کیا، اس کا بھی ذکر پہلے آیا ہے کہ اس نے لاہور کے شیخ ابراہیم کو مذہبی بے راہ روی اور سفلہ پروری کی وجہ سے چنار میں قید کر دیا، اور پھر قاضی نور اللہ شوستری

Marfat.com

جیسے مقتدر شیعی عالم کو غصہ میں اس لیے قتل کرادیا کہ ان کی بعض باتوں سے اس کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگی، ان کی موت شیعوں کے لیے ایک بڑا المناک حادثہ ہے، جس کا دکھ ان کو اب تک ہے، اسی لیے وہ شہید ثالث کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں،

ملا عبدالقادر جیسے متشدد سنی عالم بھی قاضی نوراللہ شوستری کے لیے بہت اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ملا صاحب نے اکبر اور اس کے دین الٰہی کے حامیوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے ان پر غیر معمولی تعصب اور تنگ نظری کا الزام آتا ہے، لیکن وہ قاضی نوراللہ شوستری کے متعلق لکھتے ہیں :-

اگرچہ شیعی مذہب است، اما بسیار صفت وعدالت ونیک نفسی وحیا وتقوی و عفاف اوصاف اشراف موصوف است، وبعلم وحلم وجودت فہم وحدت طبع وسقائی قریحہ وذکا مشہور است، صاحب تصانیف لائقہ است''

لیکن ان خوبیوں کے باوجود قاضی نوراللہ شوستری کی بعض باتوں سے جہانگیر ان سے کچھ ایسا بدظن ہوا کہ اس نے اپنے شیعی امرا کے جذبات کا خیال کیے بغیر اور اس نے ان کو قتل کرادیا، یہ واقعہ ۱۰۱۹ھ یعنی اس کے پانچویں سال جلوس کا ہے نورجہاں ایک سال کے بعد محل میں داخل ہوئی تھی، اس کی موجودگی میں شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا، جہانگیر غالباً اپنی ندامت میں اس حادثہ کا ذکر اپنی تزک میں نہیں کرتا ہے، لیکن ایسے مقتدر شیعہ عالم کا قتل جہانگیر کے تمام شیعی امرا کے لیے بہت ہی تکلیف دہ رہا،

اس حادثہ کے نو سال کے بعد جہانگیر کا تصادم حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ہوا، اور اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے ایک خواب کا ذکر اپنے مرشد

Marfat.com

حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے ایک مکتوب میں کیا، جس میں تحریر فرمایا :۔

دوسری غرض یہ ہے کہ دوسری دفعہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے، نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کا مقام ہے، اور دوسرے خلفاؓ کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں، اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا، جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے، اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا، بندہ اس مقام پر بھی پہنچا، اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقش بند قدس سرہٗ کو ہر مقام میں اپنے ساتھ ہمراہ پاتا تھا، اور دوسرے خلفاء کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور و ثبات کے کچھ فرق نہیں ہے، اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا ظاہر ہوا اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا بلند تھا، جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا اونچا بناتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور

مقام رنگین اور منقش تھا، اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین پایا۔"

(ماخوذ از مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی اردو ترجمہ از قاضی عالم الدین صاحب)

اس خط کی شہرت پھیلی تو کچھ بد باطن اشخاص نے ان پر الزام رکھا کہ انھوں نے اپنے کو حضرت ابوبکرؓ سے افضل تر قرار دیا ہے، لیکن وہ اس الزام کی تردید اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھ کر کرتے ہیں:۔

وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے

اس کا امر دو حال سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل.....

یا وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے

اہل سنت وجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے، تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے

جو اپنے آپ کو افضل جانے۔"

جہانگیر کو بھی حضرت مجددؒ کے اس خط کی خبر ملی، اس کو اس کا یہ مطلب سمجھایا گیا کہ حضرت احمد سرہندی اس کے دعویدار ہیں کہ وہ مقام محبوبیت میں پہنچکر خلفائے راشدین سے زیادہ مقرب الٰہی ہوگئے ہیں،

تذکرہ نگاروں اور مقالہ نویسوں کی روایت ہے کہ دربار میں حضرت مجدد الف ثانیؒ طلب کیے گئے، جہانگیر نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ افضل سمجھتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ میں حضرت علیؓ کو تو ان پر فضیلت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں، اپنے کو ان سے افضل تر سمجھنے کا کیا سوال ہو سکتا ہے، میں تو اپنے کو کتے سے بھی افضل نہیں تصور کرتا ہوں، پھر ان سے پوچھا گیا کہ تقرب الٰہی میں اپنے کو حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام سے گزرتا ہوا

کیوں لکھا ہے، جواب دیا کہ دربار کا کوئی امیر بڑے منصب داروں کے مقام سے گذرتا ہوا تخت شاہی سے تقرب حاصل کرتا ہے، تو کیا وہ ان منصب داروں سے معزز اور افضل تر سمجھا جاتا ہے؟ جہانگیر جزبز ہوا، لیکن فوراً ہی اس نے سجدۂ تعظیمی نہ کرنے کی بازپرس کی، حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ سجدہ بجز خداوند قدوس کے کسی اور کے لیے جائز نہیں، دربار کے شیخ اسلام مفتی عبدالرحمٰن نے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا، لیکن حضرت مجددؒ نے فرمایا کہ یہ رخصت ہے، اور عزیمت کے خلاف ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے، اس خلاف توقع جواب کو سن کر جہانگیر نے مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا، مگر کہا جاتا ہے کہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرمارہے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے، جہانگیر نے منفعل ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کیا اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور پھر ان کی ذات اقدس سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ روزانہ مغرب کے بعد وہ ان سے ملاقات کرتا، اور ان کے سرچشمۂ علم وفضل سے اس کے قلب کی تطہیر ہوتی گئی،

لیکن اس سلسلہ میں خود جہانگیر کا بیان جو تزک جہانگیری میں ہے، وہ ایک عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنے چودھویں سال جلوس میں لکھتا ہے:۔

" ان ہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی نے ایک جعل ساز (شیادے) نے سرہند میں مکروفریب (زرق وسالوس) کا جال بچھا کر بہت سے ظاہر پرستوں کو پھانس رکھا ہے، اس نے ہر شہر اور ہر علاقہ میں ایک خلیفہ مقرر کر رکھا ہے، جو دوکانداری، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں بہت پختہ ہیں، اس نے اپنے مریدوں

اور معتقدوں کو بہت سے خرافات لکھے ہیں، ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور نام مکتوبات رکھا ہے، اس میں بہت سی مہمل اور لاطائل باتیں لکھی ہیں، جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ میں سلوک کی راہ میں ذی النورین کے مقام سے گذرا، جو نہایت اونچا اور پاکیزہ تھا، اور اس سے گذر کر مقام فاروق سے پیوست ہو گیا، اور مقام فاروق سے گذر کر مقام صدیق کو عبور کیا، ہر مقام کی تعریف اُس کے مطابق کر کے لکھا ہے کہ مقام محبوبیت میں پہنچ گیا، یہ مقام مشاہدہ تھا، جو کہ نہایت منور اور دل کش تھا، اور مجھ پر مختلف قسم کے انوار کا عکس پڑ رہا تھا، یعنی استغفر اللہ خلفاء کے مقام سے گذر کر ان سے عالی تر مقام پر پہنچ گیا، اس نے اسی طرح کی اور بھی گستاخانہ باتیں لکھی ہیں، جن کا لکھنا طوالت اور بے ادبی ہے، میں نے اسی بنا پر حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہو، میرے حکم کے مطابق آیا اور جو کچھ میں نے پوچھا اس کا معقول جواب نہیں دے سکا، وہ ریاکار، بے عقل، مغرور، خودپسند معلوم ہوا، اس کے اس حال کی اصلاح کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ روز کے لیے اس کو قید کر دیا جائے، تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی، دماغ کی آشفتگی کچھ دور ہو جائے، اور عوام کی شورش فرو ہو جائے، اس کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا کہ اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید رکھے۔"

اس تحریر سے یہ ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر اپنے چودھویں سال جلوس تک حضرت مجددؒ سے بالکل ناواقف تھا، اور اس سال ان سے جعل ساز معرفت فروش اور مردم فریب کی حیثیت سے پہلی دفعہ واقف ہوا، اور جب ان سے ملا تو ان کو شوریدہ مزاج، آشفتہ دماغ، بے عقل، مغرور اور خودپسند پایا، تزک جہانگیری

اپنی صداقت پسندی، صاف گوئی اور حقیقت نگاری کے لیے مشہور ہے لیکن مذکورہ بالا بیان میں یہ چیزیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں، یہ کسی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے، کہ جہانگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اہمیت سے چودھویں سال جلوس تک بالکل بے خبر رہا، پہلے کہا جا چکا ہے کہ عہد اکبری میں جو غیر اسلامی اور مشرکانہ رنگ پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے پوری کوشش کی، اور شیخ فرید بخاری، خواجہ جہاں، خان خاناں عبدالرحیم خان اور دوسرے جلیل القدر امرا کو برابر خطوط لکھ کر جہانگیر کو اپنی حکومت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے پر بالواسطہ مجبور کیا، اور جہانگیر نے حکم بھی دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں اور ان کے مشورے سے ملکی نظم و نسق ایسا قائم کیا جائے کہ کوئی حکم خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہ سن کر حضرت مجدد نے شیخ فرید بخاری کو ایک مکتوب میں لکھ کر چار کے بجائے صرف ایک عالم کو منتخب کرنے کی تجویز پیش کی، تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو، شیخ فرید بخاری جہانگیر کا بہت ہی محبوب مقرب بارگاہ تھا، اس کو جہانگیر اپنا بہت بڑا مخلص اور فدائی بھی سمجھتا رہا، کیونکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ فرید کا بڑا ہاتھ رہا، اس نے اس کو مرتضیٰ خاں کا خطاب بھی دیا، اسی کے ساتھ شیخ فرید حضرت مجددؒ کا بڑا معتقد بلکہ عزیز مرید بھی تھا، اس کا انتقال جہانگیر کے گیارھویں سال جلوس میں ہوا، ظاہر ہے کہ اس کی وساطت سے جہانگیر کو حضرت مجددؒ کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہوا ہوگا، اور وہ زندہ رہتا تو جہانگیر اور حضرت مجددؒ کے اختلاف کی نوبت ہی نہیں آتی، پھر خود شہزادہ خرم اور دوسرے امرا کو حضرت مجددؒ سے جو محبت اور عقیدت رہی، اس سے جہانگیر بے خبر نہ رہا ہوگا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر اور حضرت مجددؒ میں مراسلت

Marfat.com

رہی، لیکن تعجب ہے کہ دونوں میں ملاقات نہیں ہوئی، حالانکہ جہانگیر اپنے دور کے تمام اکابر بزرگانِ دین سے مل کر اپنے اسلامی حسن باطن کا ثبوت دیتا رہا، وہ اپنے بارہویں سال جلوس میں احمد آباد گیا تو وہاں کے مشہور بزرگ شیخ اسمٰعیل بن شیخ محمد غوث سے ملا، اور ان کو خلعت اور پانچ سو روپیے دیے، اور پھر جتنے بزرگ اس سے ملنے کیلئے آئے ان کو بھی خلعت اور جاگیریں عطا کیں اور اپنے کتب خانہ خاص سے تفسیر کشاف تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ جیسی کتابیں نذر کیں اور پھر اس نے ایک عام حکم دیا کہ مشائخ کی اولادوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کی جائیں، چودہویں سال جلوس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملا تو ان کے متعلق لکھا ہے کہ دہلی کے گوشہ میں بیٹھ کر مدت سے توکل و تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کی صحبت بے ذوق نہیں ہے، طرح طرح کے مراحم و دلنوازی کر کے ان کو رخصت کیا، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے، جس میں مشائخ ہند کے حالات ہیں، اس کے لکھنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے، وہ اسی سال پنجاب گیا تو کلانور کے پاس پہنچکر اس کو سندھ کے مشہور بزرگ شیخ میر محمد مشہور بہ میاں میرؒ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، جو اس وقت لاہور میں تھے، اس کا لاہور جانا ممکن نہ تھا، اس لیے حضرت میاں میرؒ خود اس کے پاس تشریف لائے، جہانگیر ان سے مل کر متاثر ہوا، ان کے بارہ میں لکھتا ہے کہ بڑے قابل، مرتاض، مبارک نفس، صاحبِ حال، گوشہ نشین، توکل پسند اور دنیا سے مستغنی بزرگ ہیں، خلوت میں ان کی صحبت سے مستفید ہوا، اس زمانہ میں ان کا وجود غنیمت اور عزیز ہے، ان سے بڑے حقائق و معارف سننے میں آئے، میں نے چاہا کہ آپ کی خدمت میں نذر پیش کروں لیکن جرأت نہ ہوئی،

Marfat.com

آخر میں ایک سفید ہرن کی کھال جانماز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ان کی خدمت میں پیش کی۔

بزرگان دین سے اس عقیدت کے باوجود حضرت مجدد رح کے تمام کارناموں اور خوبیوں کو نظر انداز کر کے جہانگیر کا ان کو جعل ساز، دوکاندار، معرفت فروش، مردم فریب وغیرہ کہنا تعجب انگیز ہے، کیونکہ وہ طبعاً بہت ہی محبت کیش تھا، اور اس کا دل بڑا ہی دردمند واقع ہوا تھا، خود حضرت مجدد رح اس کے اسلامی حسن باطن کے معترف رہے، اس لیے اس نے حضرت مجدد رح کی شان میں جو الفاظ لکھے ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، وہ علم و فن کا بڑا داشناس بھی تھا، اس لیے حضرت مجدد رح کے مکتوبات جیسے گنجینۂ حقائق و معارف کو مہمل اور لاطائل کہنا اور بھی زیادہ بوالعجبی ہے، یا تو اس پوری عبارت کو الحاقی سمجھ کر رد کر دیا جائے، اور اگر یہ الحاقی نہیں ہے، تو پھر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ جہانگیر نے حضرت مجدد رح کی شان میں اس قسم کے نازیبا الفاظ لکھ کر نور جہاں اور اپنے شیعی امرار کی نظروں میں قاضی نور اللہ شوستری کے خون کا دھبہ اپنے دامن سے دھونے کی کوشش کی ہے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مجدد رح کی بزرگی اور شہرت کے باوجود جہانگیر نے ان سے اسیری کے واقعہ سے پہلے ملنا پسند نہیں کیا، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت مجدد رح نے اپنی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں میں شیعوں کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کیا تھا، اور ان کے اثرات کو دور کرنے کی خاطر بڑے شد و مد سے ان کے مذہبی عقائد کی تردید میں لگے ہوئے تھے، ظاہر ہے کہ وہ تمام شیعی امرار کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہے ہوں گے، ایسی صورت میں جہانگیر نے اپنے شیعی امرار کی دلداری اور دلجوئی کی خاطر ان سے ملنا پسند نہ کیا ہو، اس لیے اگر

Marfat.com

یہ کہا جاتا ہے کہ شیعی امرار نے جہانگیر کو ان کے خلاف ابھار کر ان کو قید کرا دیا تو یہ بعید از قیاس نہیں، اس سے نہ صرف قاضی نور اللہ شوستری کے قتل کا خونبہا ادا ہو گیا، بلکہ شیعیت کے خلاف بھی کچھ دنوں کے لیے سرگرمیاں کم ہو گئیں، اگر قاضی نور اللہ شوستری کے قتل سے جہانگیر کے سنی امرار خوش ہوئے ہوں گے تو اس کے شیعی امرار کو حضرت مجددؒ کی اسیری سے کچھ تسکین ضرور ہوئی ہو گی، جہانگیر کا حضرت مجددؒ کو اپنے ایک ہندو منصب دار رائے سنگھ کے حوالے کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملہ میں وہ اپنے سنی امرار پر زیادہ بھروسہ نہیں رکھتا تھا، کیونکہ اس کو سنی امرار میں ان کی مقبولیت کا اندازہ رہا ہو گا،

اس اسیری کے بعد تذکرہ نگار تو یہ لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنی غلطی پر منفعل ہو کر حضرت مجددؒ کو رہا کر دیا، اور ان سے معذرت کی لیکن وہ خود اپنے پندرہویں سال جلوس میں لکھتا ہے کہ

> "شیخ احمد سرہندی دکان آرائی، خود فروشی اور بے صرفہ گوئی کی خاطر کچھ دنوں کے لیے زندانِ ادب میں محبوس تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر رہائی دی، خلعت اور خرچ کے لیے ایک ہزار روپے بھی دیے، اور ان کو اختیار دیا کہ وہ چاہے چلے جائیں یا میرے ساتھ رہیں، انھوں نے انصاف کے ساتھ عرض کیا کہ اس تنبیہ اور تادیب سے ان کو ہدایت حاصل ہوئی، انھوں نے ساتھ رہنے ہی میں اپنی مراد بر آری دیکھی"

اگر یہ عبارت بھی الحاقی نہیں تو جہانگیر کے اس بیان میں بھی شیعی اعزہ اور امرار کی دلدہی کے جذبہ کا اظہار ہوتا ہے، اس ناخوشگوار واقعہ کا انجام خوشگوار طریقہ پر ہوا، رہائی کے بعد جہانگیر اور حضرت مجددؒ دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے، حضرت مجددؒ

Marfat.com

اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"الحمد اللہ۔۔۔۔۔۔ بادشاہ کے ساتھ عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالے کی عنایت سے ان گفتگوؤں میں بال برابر مداہنت نہیں دخل پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم واستقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسلؐ کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجددؒ اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدار، اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور دوسرے موضوع پر بہت کچھ مذکور رہا، اور بادشاہ بڑی خوشی سے سنتے اور سب کچھ قبول کرتے رہے"

اس خط سے ظاہر ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے، لیکن بعض تذکرہ نویس اور مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے حضرت مجددؒ کو رہا کرنے کے بعد اپنے ساتھ رکھ کر نظر بند کر رکھا تھا، لیکن یہ محض بدگمانی اور غلط قسم کی قیاس آرائی ہے، ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ جہانگیر آخر میں حضرت مجددؒ سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخؒ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے، کچھ اہل قلم اس روایت کو مستند نہیں سمجھتے اور اس کی تردید میں اپنا زور قلم خواہ مخواہ صرف کرتے ہیں، لیکن اس کو صحیح مان لیا جائے تو کیا ہرج ہے، دوسری تو میں

Marfat.com

طرح طرح کی روایتیں گڑھ کر اپنی تاریخ بنا رہی ہیں، اگر ہماری تاریخ میں کچھ ایسی روایتیں ملتی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت دونوں مصدقہ نہیں، لیکن اگر ان سے تاریخ کا کوئی پہلو روشن ہوتا ہے، تو ہمارے اہل قلم کو بلاوجہ اس کی تردید کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، اس سے نہ صرف ہماری تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، بلکہ ایک دوسرے کی تردید اور تائید کرنے میں خواہ مخواہ علمی اور تحقیقی سرگرمیاں برباد ہوتی رہی ہیں؛

سرمد کی شہادت | عالمگیری عہد کا ایک بہت بڑا المیہ سعیدائے سرمد کی شہادت ہے، وہ نسلاً کاشانی یہودی تھے، اسلام لانے سے پہلے اُن کا شمار علمائے یہود میں تھا، وہ توریت کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد فلسفہ و حکمت میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی، جس کا اظہار انھوں نے اپنی رباعیوں میں جابجا کیا ہے، وہ ایک ممتاز رباعی گو کی حیثیت سے بھی مشہور رہوئے، تجارت ان کا خاندانی پیشہ تھا، اسی سلسلہ سے اپنے وطن کاشان کو چھوڑا تو خلیج فارس کے راستے سے ہوتے ہوئے ٹھٹھ آئے، یہاں ان کو ابھے چند نامی ایک ہندو لڑکے سے محبت ہوگئی لڑکے نے بھی ان کی مریدی اختیار کرکے ان سے عبرانی، توریت اور زبور پڑھنا شروع کیا، اور ان کی نگرانی میں توریت کے ابتدائی چھ ابواب کے ترجمے فارسی میں کیے، جن کو دبستان المذاہب کے مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے؛ ٹھٹھ کے قیام میں حضرت سرمد اس قدر مغلوب الحال ہوگئے تھے، کہ بیخودی کے عالم میں کوچہ اور بازار میں برہنہ دکھائی دیتے تھے، اسی مجذوبانہ کیفیت میں وہ حیدرآباد دکن پہنچے، اور وہاں سے شاہجہاں کے عہد میں دہلی آئے، ان کی عارفانہ رباعیوں کی شہرت دہلی پہلے پہنچ چکی تھی، اس لیے ان کے پاس ان کا کلام سننے کے لیے،

Marfat.com

لوگوں کا بڑا مجمع رہنے لگا، دارا شکوہ بھی ان کا گرویدہ ہوگیا، اور انھوں نے پیشن گوئی کی کہ شاہجہان کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، اس سے دارا شکوہ کی گرویدگی اور بڑھ گئی .... وہ دارا شکوہ کے سامنے آتے تو اپنی عریانی چھپانے کے لیے کمر میں کپڑے کا کوئی ٹکڑا باندھ لیتے، لیکن جب اورنگ زیب اور دارا کے درمیان جانشینی کی جنگ ہوئی تو دارا کو شکست ہوئی، اور پھر وہ ارتداد، الحاد، اور کفر کے الزام میں تہ تیغ ہوا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ عالمگیر نے تخت نشینی کے بعد سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے دارا شکوہ کو بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی؟ سرمد نے جواب دیا کہ وہ مژدہ صحیح نکلا، کیونکہ دارا کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی ہے، یہ جواب اورنگ زیب کو ناگوار گزرا، بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ان کی رباعیوں میں حسب ذیل رباعی کی شہرت ہوئی،

آنکو کہ سر حقیقتش باور شد خود پہن ترا ز سپہر پہنا ور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بہ فلک سرمد گوید فلک با حمد در شد

تو ان پر الزام رکھا گیا کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ قاضی عبدالقوی فقہی جزئیات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب میں بھی بہت سخت تھے، ان کو حضرت سرمد کی برہنگی بڑی ناگوار تھی، اس لیے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا کہ "شیطان قوی است" اور پھر یہ رباعی پڑھی:-

خوش بالائے کردہ چنیں پست مرا چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش دردے عجبے برہنہ کردہ است مرا

قاضی عبدالقوی مذکورۂ بالا جواب اپنے اوپر طنز سمجھے اور انھوں نے ان پر عریانی کا

جرم قائم کر کے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا، لیکن عالمگیر نے کہا کہ صرف عریانی وجہ قتل نہیں ہو سکتی ہے، بعض تذکروں میں یہ بھی ہے کہ عالمگیر نے ان کو دربار میں بلا کر ان سے برہنگی کا سبب پوچھا تو انھوں نے یہ رباعی پڑھی :-

آنکس کہ ترا سریر سلطانی داد   مارا ہمہ اسباب پریشانی داد

پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید   بے عیباں را لباس عریانی داد

ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جز یعنی لا الہ پڑھتے ہیں،

اسطرح حضرت سرمد پر مختلف قسم کے الزامات تھے، علماء ان سے خوش نہ تھے، اور خود عالمگیر کو بھی ان سے ناگواری تھی، اس لیے وہ علماء کے ایک اجتماع میں طلب کیے گیے، دربار میں ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا، تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جز یعنی لا الہ پڑھا، علماء نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس فتویٰ کے بعد دربار سے سرمد قتل گاہ کی طرف چلے تو تمام شہر امنڈ پڑا، اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا، لیکن حضرت سرمد پر کوئی اثر نہ تھا، وہ اطمینان وسکون کے ساتھ رباعیاں کہتے جا رہے تھے، اور جب جلاد تلوار لیکر ان کی طرف بڑھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے،

رسیدہ یار عریاں تیغ ایں دم   بہر رنگے کہ آئی می شناسم

پھر یہ اشعار پڑھے -

شورے شد از خوابِ عدم چشم کشودیم — دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

سرمد اگر داز تنم شوخے کہ با ما یار بود — قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں سرِ کشتہ سے دیر تک کلمہ طیبہ کی آواز بلند ہوتی رہی، واللہ اعلم، اور ان کی ذات سے لوگوں کی گرویدگی آج تک باقی ہے، اور انھوں نے وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، جبر و اختیار، محبت الٰہی، ذکر الٰہی، رضائے الٰہی، دیدار الٰہی دیدار نبوی پر جو رباعیاں کہی ہیں، وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کی عارفانہ انفرادیت ان کی مجذوبانہ کیفیت میں کچھ ایسی گم ہو کر رہ گئی ہے کہ ان کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنے بیٹھتا ہے تو طرح طرح کی موشگافیاں کرتا ہے، چنانچہ کلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر جے فشل نے حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں "ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے مغل شاہنشاہوں کے دربار میں یہودی اور یہودیت" کے عنوان سے ایک مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمد بظاہر مسلمان ہو گئے تھے، لیکن انھوں نے اسلام برائے نام قبول کیا تھا، وہ ہمیشہ یہودیوں کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کو قبول نہ کریں، اور انھوں نے ہندوستان پہنچ کر یہودیت کی بڑی خدمت کی، اس لیے وہ یہودی مذہب کی تاریخ میں نمایاں جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں، ان کی پہلی خدمت تو یہ تھی کہ انھوں نے دبستان المذاہب جیسی اہم کتاب کے مصنف سے علمی اشتراک کرکے یہودیت کو فارسی جاننے والے ہندوستانیوں سے روشناس کیا، ان کی دوسری خدمت یہ تھی کہ ان ہی کی وساطت سے ہندوستان میں توریت کا فارسی ترجمہ رائج ہوا، تیسری بڑی خدمت یہ تھی کہ انھوں نے دارا شکوہ کو یہودی عقائد سے واقف کرایا،

پروفیسر مذکور آخر میں یہ لکھتے ہیں کہ سرمد کے قتل کرانے کی ایک بڑی وجہ اُن کی یہودیت بھی تھی، انھوں نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا لیکن وہ اسلام سے سطحی طور پر متاثر تھے، وہ صوفی بن کر شاہی خاندان کو اپنے زیر اثر لا رہے تھے، اور نگزیب نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا تھا، چنانچہ دارا کے قتل کے محضر میں اس نے یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ دارا شکوہ کے ذریعہ یہودیت اور کفر کا غلبہ ہو جاتا،

پروفیسر مذکور یہودی ہیں اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خود ان کی یہودیت کی فتنہ سامانی اور شر انگیزی ہے، سرمد سے عام مسلمانوں کو جو عقیدت پیدا ہو گئی ہے، اس کو وہ کسی طرح زائل کرنا چاہتے ہیں، علمار اور عالمگیر نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا، وہ صحیح تھا یا غلط، اس بحث سے قطع نظر ہو کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی ان کے مرقد پر زائرین کا مجمع رہتا ہے، جو اُن کی مقبولیت کی دلیل ہے اور موجودہ دور کا بڑے سے بڑا متقشف عالم بھی ان کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتا،

صوفیہ کرام کی شان استغنار اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوا ہو گا کہ بعض سلاطین کو کچھ صوفیہ سے ذاتی یا سیاسی یا مذہبی اختلافات ضرور رہے، لیکن ان کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں، زیادہ تر سلاطین اکابر صوفیہ کی بارگاہوں میں سر نیاز خم کرتے رہے، لیکن ان روحانی بزرگوں نے ان سے قریب ہونے کے باوجود ان سے دور رہ کر اپنی روحانی عظمت برقرار رکھی، اور اپنی فقیری کی شان ان سے مستغنی اور بے نیاز رہنے ہی میں تصور کی، اور ان سے کسی قسم کا مادی فائدہ اٹھانا اپنے لیے سم قاتل سمجھتے رہے، سلطان التتمش حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید تھا اس کو حضرت خواجہ کے گھر والوں کی عسرت اور تنگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے وزیر کے معرفت کچھ گاؤں کا

Marfat.com

فرمان لیکر ان کی خدمت میں بھیجا، خواجہ صاحب نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی قبول کر لیتے، اگر ہم گاؤں لے لیں تو قیامت کے روز اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے، سلطان ناصرالدین محمود نے حضرت بابا گنج شکرؒ کی خدمت میں اپنے وزیر الغ خاں کو چار گاؤں کا فرمان اور ایک کثیر رقم بطور ہدیہ دے کر بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیا ان کو دو، جن کو ضرورت ہو، اسی طرح ایک بار ان کی خدمت میں اجودھن کے والی نے کچھ گاؤں اور نقد رقم پیش کرنے کی کوشش کی تو فرمایا کہ اگر میں یہ گاؤں اور رقم لے لوں تو مجھے لوگ درویش نہ کہیں گے مالدار کہیں گے، اور میرا لقب درویش دیہہ دار ہو جائے گا،

اگر اصرار کر کے سلاطین اور امرار کچھ نذرانے ان اکابر صوفیہ کو پیش کرتے تو وہ ایک ہاتھ سے لیکر دوسرے ہاتھ سے مساکین اور غربار میں تقسیم کر دیتے سلطان محمد تغلق نے حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کے پاس شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاءالدین برنی کو ایک لاکھ ٹنکے دے کر بھیجا، انھوں نے اتنی بڑی رقم دیکھکر فرمایا یہ درویش ایک لاکھ ٹنکے لیکر کیا کرے گا اور لینے سے انکار کر دیا، شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاءالدین برنی سلطان کے پاس واپس گئے، سلطان نے پچاس ہزار ٹنکے دے کر پھر دونوں کو بھیجا، لیکن شیخ نے ان کو بھی قبول نہیں کیا، بالآخر دو ہزار ٹنکے بھیجے گئے، لیکن ان کو بھی قبول نہیں کیا، اور فرمایا، درویش کے لیے دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، لیکن جب اصرار کیا گیا تو انھوں نے دو ہزار کی رقم لے لی کچھ تو اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کو مزار کے لیے محفوظ رکھی اور بقیہ

Marfat.com

فقراء میں تقسیم کر دی،

اسی طرح سلطان محمد تغلق نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحؒ کے اخراجات کے لیے ایک پرگنہ کی جاگیر کا فرمان جاری کیا، اور اپنے مقطع کو حکم دیا کہ اگر وہ قبول نہ کریں تو بھی زبردستی دیا جائے، شاہی مقطع کی گلو خلاصی کی خاطر انھوں نے یہ جاگیر قبول کر لی، لیکن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی جاکر یہ فرمان واپس کر دیا کہ یہ ان کے کام کا نہیں، فیروز شاہ تغلق نے حصول برکت کی خاطر کچھ خدمت کرنی چاہی اور ایک بڑی رقم پیش کی، اس کو قبول تو فرمالیا لیکن شاہی دربار سے نکلتے ہی فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا، اور درویشانہ استغنا کے ساتھ خالی ہاتھ وطن کی طرف مراجعت کی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا مطبخ ہمیشہ گرم رہتا، کئی ہزار فقراء اور مساکین ان کے مطبخ میں روزانہ کھانا کھاتے، ان اخراجات کے لیے ان کے یہاں بکثرت نذرانے آتے، لیکن دن کو جو چیزیں خانقاہ میں آتیں، شام تک تقسیم کر دی جاتیں، ان کی خانقاہ میں دنیاوی ساز و سامان جمع ہو جاتے تو ان کو دیکھ کر ان پر گریہ طاری ہو جاتا، اور اگر کسی وقت کوئی قیمتی چیز بطور تحفہ آجاتی تو اور بھی زیادہ آہ و بکا کرتے اور ہدایت دیتے کہ یہ جلد از جلد فقراء میں تقسیم کر دی جائے اور جب یہ محتاجوں کو پہنچ جاتی تو ان کو اطمینان ہوتا، وہ ہر جمعہ کو تجرید فرماتے، یعنی وہ اپنے تمام حجروں اور انبار خانوں کو بیانتک خالی کرا دیتے کہ ان میں جھاڑو دیدی جاتی، اس کے بعد جامع مسجد تشریف لے جاتے اور اطمینان سے نماز ادا کرتے، وہ بادشاہوں اور شہزادوں سے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کرتے اور کوئی پیش کرتا تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے کہ یہ لوگ

Marfat.com

درویشی کو غارت کرتے ہیں،

اکابر صوفیہ کی اولادوں کی روایت شکنی آگے چل کر ان بزرگوں کی اولادوں اور سجادہ نشینوں میں یہ شان باقی نہیں رہی، سلاطین وقت نے ان کو عہدے دیے، تو ان کو قبول کر لیا، اور ان کی خانقاہوں کے لیے جاگیریں عطا کیں تو خوشی سے منظور کر لیں بلکہ جاگیریں حاصل کرنے کی کوشش کی،

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے صاحبزادے اور سجادہ نشین شیخ علاء الدین اجودھنی شاہی دربار کی حاضری کو نجس اور پلید سمجھتے رہے اسی لیے جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، جب حضرت رکن الدین ملتانی دہلی کے دربار سے واپسی میں اجودھن ان کی ملاقات کو آئے اور ان سے معانقہ کیا تو انھوں نے معانقہ کے بعد غسل کیا کہ دربار کی نجاست دور ہو جائے، لیکن خود ان کے صاحبزادوں میں شیخ معز الدین اور شیخ علم الدین نے محمد تغلق کے عہد میں عہدے قبول کیے، اول الذکر گجرات کے ناظم ہوئے اور آخر الذکر شیخ الاسلام کے عہدے پر مامور کیے گیے،

حضرت شیخ عبد القدوسؒ کے پوتے ملا عبد النبی اکبر کے زمانہ میں صدر الصدور بنے تو بن گئے، لیکن آخر میں اکبر کو ان سے جو اختلاف ہوا تو ان کو قید خانہ میں بند کر دیا، جہاں رہ کر عالم بقا کو سدھارے، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ اکبر نے حضرت غوث گوالیاریؒ کو ایک کرور درہم کی جاگیر دی تھی، اس لیے ان کے اخراجات بہت تھے، اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شاہانہ کر و فر کے ساتھ سفر کرتے تھے،

حضرت شیخ سلیم چشتیؒ نے راہ سلوک طے کرنے میں بڑی ریاضت کی، اور انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، لیکن ان کے معاصر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا بیان ہے

Marfat.com

کہ آخر میں ان میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، انھوں نے عمارتیں بنوانی شروع کین، باغ لگوائے اور کنوئیں کھدوائے، اور بعض عادتیں جو شریعت کے خلاف تھیں، عوام کی طرح ان میں بھی پیدا ہو گئیں، یہ تبدیلی شاہی دربار سے تعلقات کے بعد ہوئی، جہانگیر نے ان کی اولادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دینے شروع کیے، ان کے پوتے اسلام خاں فاروقی چشتی کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا، عجیب وغریب صفات رکھتے تھے، میدان جنگ میں ہاتھی سے لڑ جاتے تھے، اور اس کو زمین پر دے مارتے تھے، خاندانی روایت کے مطابق صوفی بھی تھے، زندگی بھر جوار کی روٹی، ساٹھی کا چاول اور ساگ کھاتے رہے، مذہبی احکام کے بھی بڑے پابند تھے، لیکن امارت آئی، تو لوازم امارت کی خاطر فنون لطیفہ کی بھی سرپرستی کرنے لگے اور بنگال کے رقص وسرود کے ارباب کمال مثلاً لولی، ہورکنی، کنچنی اور ڈومنی پر نولاکھ ساٹھ ہزار سالانہ خرچ کیا کرتے تھے،

ہر خانقاہ کے لیے سلاطین نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے متولی اور سجادہ نشین اپنے اسلاف کی روایت کے خلاف مالدار، دیہہ دار اور جاگیردار بن بیٹھے، اور ان میں نفس کشی کے بجائے نفس پروری، ریاضت و عبادت کے بجائے امارت وجاہ پسندی اور فقر وفاقہ کے بجائے تن آسانی وراحت پروری آگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطین پہلے ان کی بارگاہ میں جبیں سائی کرتے تھے لیکن اب وہ خود ان کے فیض وکرم کے زلہ ربا ہو گئے، دارا شکوہ کے پیر ملا جیو اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہو گے تو خدا سے پھر جاؤ گے، وہ اپنے مریدوں سے

دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، آگے چل کر محمد شاہ رنگیلے نے اپنے زمانے میں ایک صوفی شاہ مبارک کو برہان الطریقت کا خطاب دیا، اور ایک دوسرے بزرگ شاہ بدا کو برہان الحقیقت کے لقب سے نوازا، اور شاہ رمز کو فصیح البیان کا خطاب دیا،

آخری دور میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی اور حضرت شاہ فخر الدین دہلوی جیسے بزرگوں نے صوفیہ کرام کی استغنار کی عظمت اور توکل کی شان کو برقرار رکھنے کی ضرور کوشش کی، لیکن دنیا دار صوفیہ کی وجہ سے خانقاہوں کی اہمیت بھی جاتی رہی، اور جہاں علم، معرفت تقوی، دینداری، اخلاص، استغنار، توکل، حقوق العباد، حقوق اللہ اور تہذیب نفس کی بہترین تعلیمات حاصل ہوا کرتی تھیں، وہاں معرفت فروشی، مردم فریبی اور تصوف کی دوکان داری ہونے لگی، خواجگان چشت کی تعلیم یہ تھی کہ سالک تمام دنیاوی آلائشوں سے پاک رہے، حتی کہ وہ اپنے رزق سے بھی بے غم رہے اور اگر اس کے لیے اندوہ گیں رہتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے... کیونکہ خداوند تعالیٰ خود اس کا رزق اس کے پاس پہنچائے گا، پھر بھی اس کا توکل یہ ہونا چاہیے کہ اس کو جو کچھ بھی ملے راہ خدا میں دیدے، اور اگر رزق جمع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تمام عنایتوں سے محروم ہو جاتا ہے، حضرت مجدد الف ثانی رح نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ فقیروں پر لازم ہے کہ وہ اپنے کو ہمیشہ ذلیل، محتاج اور مسافر سمجھیں، روتے اور التجا کرتے ہوئے زندگی گذاریں، اور اپنے عیبوں کو دیکھتے، گناہوں کے غلبہ کا مشاہدہ کرتے اور علام الغیوب سے ڈرتے رہیں، اپنی نیکیوں

کو تھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں، اگرچہ تھوڑی ہوں اور مخلوق میں مشہور اور مقبول ہونے سے ڈرتے رہیں، لیکن یہ تمام شرائط جاگیر دار صوفیہ نے پوری نہیں کیں، اور جن کو جاگیریں نہیں ملیں وہ عملیات، تعویذوں اور گنڈوں کے ذریعہ مشہور ہو کر رزق جمع کرنے کی فکر میں لگے رہے، ایسے ہی ریاکار صوفیہ کے نمونے دیکھ کر علمار کا ایک بڑا گروہ نہ صرف انکا مخالف بلکہ سلوک و تصوف کا بھی نکتہ چین رہا،

علمار اور صوفیہ | اور یہ عجیب بات ہے کہ تمام اکابر صوفیہ نے علمار ہی کی طرح تعلیم حاصل کی، لیکن علمار اور صوفیہ کی تفریق خوامخواہ پیدا ہو گئی، حضرت بختیار کاکیؒ نے تمام ظاہری علوم کی تعلیم پائی تھی، حضرت بہار الدین زکریا سہروردیؒ نے کلام پاک ساتوں قراتوں کے ساتھ حفظ کیا تھا، اور پندرہ سال تک خراسان اور بخارا میں تحصیل علم کرتے رہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے بھی کلام پاک حفظ کیا، اور فقہ کی کتاب نافع مولانا منہاج الدین ترمذی سے پڑھی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نے آکر کہا کہ مولانا نظام الدین! علم بہت بڑا حجاب ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیارؒ کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے، لیکن بڑا حجاب کیونکر ہو سکتا ہے؟ مجذوب نے کہا، جب اس جگہ پہونچو گے تو معلوم ہو جائے گا، اس کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اپنے مرشد حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں پہنچے اور مجذوب کی باتیں کہہ سنائیں، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا کہ حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی، دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں،

Marfat.com

جو شخص ان سے توبہ کرے گا اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے جس کو ہر شخص نہ عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے، جس وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہیں ہوگی، خدا کی محبت، معرفت اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے علم ایک بڑا حجاب ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے قدوری، حریری، مشارق الانوار کی باضابطہ تعلیم پائی، اور جب ان کی دستار فضیلت باندھی گئی تو بدایوں کے علماء اور مشائخ دونوں اس تقریب میں شریک تھے، ان کا شمار متبحر علماء میں بھی ہوتا رہا، ان کے مرید ان کے علمی تبحر سے بھی استفادہ کرتے تھے، اسی لیے ان کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہتا تھا۔

اکابر صوفیہ کی علمی فضیلت کے معترف سب ہی ہوتے، مثلاً مولانا قطب الدین کاشانی دہلی آئے اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ کی تصانیف پڑھیں تو اپنے ہمراہی علماء سے کہا کہ اے یارو! جو کچھ ہم نے اور تم نے پڑھا ہے وہ سب ان تصانیف میں موجود ہے، اور جو کچھ نہیں پڑھا ہے وہ علم بھی ان کتابوں میں موجود ہے، اسی طرح حضرت شیخ صدر الدین عارف، حضرت شیخ ابو الفتح رکن الدین، حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت بہاء الدین نقشبندی، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ اور دوسرے اکابر مشائخ کا درجہ علوم ظاہری میں جید علماء سے کم نہیں، لیکن اس حقیقت کے باوجود علماء اور صوفیہ کی تفریق پیدا ہو گئی، اور غلط یا صحیح وہ دو علیحدہ علیحدہ گروہ سمجھے گئے، اور چھوٹی بڑی

Marfat.com

بہت سی باتوں پر دونوں میں اختلاف پیدا ہوتے رہے،

شریعت وطریقت کا جھگڑا، علمار کو صوفیہ سے اختلاف کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ برابر ڈرتے رہے، کہ کہیں طریقت اور حقیقت کے مسائل و افکار میں شریعت گم ہو کر نہ رہ جائے، حالانکہ جتنے اکابر صوفیہ گذرے ہیں، وہ برابر یہ کہتے رہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی اسیطرح شریعت حقیقت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، خود حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی یہ تعلیم رہی کہ صوری حیثیت سے اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلافِ شریعت سرزد نہ ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا، جس کا نام طریقت ہے، اور جب اس میں ثابت قدم رہیگا، تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا، اور جب اس میں بھی پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا، اس کے بعد وہ جو کچھ مانگے گا اس کو ملے گا، اسی لیے خواجہ صاحب نے شریعت کے تمام ارکان اور جزئیات کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے، اور یہی مسلک چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا رہا،

سہروردیہ سلسلہ میں حضرت صدر الدین عارفؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کو محبوب رکھے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام پیمبروں میں افضل سمجھے، اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کو صحیح اور درست سمجھے، خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں، اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کرے تاکہ اعتقاد درست رہے، کیونکہ خود رسول اللہؐ نے اللہ کے حکم کو جانا اور اس کی کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی،

(علماء و

فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اپنے مکتوبات میں فرمایا ہے کہ شریعت کے بغیر راہ سلوک میں قدم رکھنا جہالت اور ہلاکت ہے، شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت معلوم ہوتی ہے، ایک سالک کو شریعت سے واقفیت نہیں تو وہ طریقت اور حقیقت سے آگاہی نہیں حاصل کر سکتا ہے، حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ اور شریعت بغیر حقیقت کے نفاق ہے،

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ہر مکتوب میں مکتوب الیہ کو شریعت کی پابندی کی تعلیم و تلقین کرتے رہے، وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ صدیقین کی دلی آرزو اور اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ حضرت مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی کمال متابعت سے مشرف ہوجائے، اس کے سوا سب کچھ جھوٹے وہم اور بیہودہ خیالات ہیں، سلام ہو اُس شخص پر جس نے ہدایت پائی، اور حضرت مصطفیٰ علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو ہمیشہ لازم جانا،

لیکن رفتہ رفتہ صوفیہ میں کچھ ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا جو یہ کہتا کہ ایمان کی علت معرفت ہے، اگر معرفت ہو اور طاعت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بندہ سے مواخذہ نہ کرے گا لیکن طاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو بندہ نجات نہیں پائے گا،

کچھ ایسے صوفیہ بھی پیدا ہو گئے جو اپنے کو قلندر کہتے، نماز نہیں پڑھتے اور روزے نہیں رکھتے، ان کے ترک فرائض کی یہ تاویل کیجاتی کہ یہ لوگ ایک وقت اور ایک حال میں اسی روح اور جسد کے ساتھ کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں، اس لیے ایک جگہ تو بظاہر تارک فرائض نظر آتے ہیں، لیکن اسی وقت وہ دوسری جگہ فرض بجالاتے ہیں، کچھ ایسے صوفیہ بھی ہو گئے جو اپنے کو مجذوب کہتے اور شریعت کی کوئی پابندی نہ کرتے،

ان کے بارہ میں کہا جاتا کہ وہ عالم جنون میں رہتے ہیں، اور مجنون پر تکلیفات شرعیہ نہیں، علماء کی نظروں میں یہ باتیں کھٹکتیں، گو اکابر صوفیہ خود اس کی تردید کرتے رہتے کہ وہ معرفت پسندیدہ نہیں، جس میں طاعت نہ ہو، ان کے نزدیک معرفت شوق اور محبت کا نام ہے، شوق اور محبت کی علامت طاعت ہے، شوق اور محبت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی، اسی قدر فرمانِ الٰہی کی تعظیم بڑھتی جائے گی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے تو ایسے صوفیہ پر لعنت بھیجی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حقیقت کا جب کشف ہو جاتا ہے تو پھر شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، انھوں نے تو کتاب، سنت اور اجماعِ امت کی تقلید کو ہر حال میں ضروری قرار دیا ہے، اور دوسرے خانوادوں کے بزرگوں کی بھی یہی تعلیم رہی،

لیکن اکابر صوفیہ کے اس مسلک کے باوجود کچھ ریاکار متصوفین ایسے بھی تھے جو نماز کے پابند نہ ہوتے اور کہتے کہ وہ عالم سکرات میں ہیں، عریاں رہتے اور لوگوں کو یقین دلاتے کہ عالمِ جذب میں ہیں، حسن پرست ہو کر ہوسناک بنجاتے لیکن اعلان کرتے کہ اس طرح ذات الٰہی کی صفتِ جمال کے مشاہدہ میں مشغول ہیں، عشق مجازی کی بوالہوسی میں مبتلا رہتے لیکن عشق حقیقی کا دم بھرتے، گمراہی اور ضلالت اختیار کیے ہوتے، لیکن انا الحق کا نعرہ لگاتے اور دوسروں کو باور کراتے کہ خداوند تعالیٰ کی روح ان میں حلول کر گئی ہے، ٹونے، ٹوٹکے اور جادو کرتے لیکن ان کو کشف و کرامات کہتے، ایسے متصوفین نے محض دنیاوی مال و منال اور جاہ و حشمت کی خاطر اپنے کو صوفی ظاہر کر کے تصوف کو بدنام کیا، پاک نہاد صوفیہ بھی ان کو برا سمجھتے، لیکن علماء کا ایک گروہ ان ہی کے نمونے دیکھ کر تصوف کا ناقدر رہا،

Marfat.com

اور کبھی کبھی علمائے ظاہر کو اکابر صوفیہ کے ملفوظات اور تصانیف میں بھی کچھ ایسی باتیں مل جاتیں جن سے وہ بدظن ہو جاتے، رفتہ رفتہ تصوف ایک ایسا فلسفہ بن گیا کہ توحید، ایمان، نفس کشی، ولایت و کرامت، فنا و بقا، غیبت و حضور، جمع و تفرقہ، حلول روح، معرفت، عشق الٰہی، وصال الٰہی، اور مشاہدۂ حق وغیرہ جیسے تصورات اور مسائل پر علماء اور صوفیہ کے درمیان مستقل اختلاف پیدا ہو گیا، جس کے خلیج کو وحدۃ الوجود کے مسئلہ نے اور بھی زیادہ وسیع کر دیا،

ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیۂ کرام میں زیادہ تر خشیت الٰہی کا غلبہ رہا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ارشاد تھا کہ عارف کے لیے تین ارکان ضروری ہیں، ہیبت، تعظیم اور حیا، اپنے گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے، طاعت گذاری تعظیم ہے، اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ خشیتِ الٰہی کی بنا پر کشتۂ خنجر تسلیم ہوئے، ان بزرگوں پر خداوند تعالیٰ کی ہیبت ایسی طاری رہتی کہ وہ برابر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ ریاضت کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنا ان کے لیے مشکل تھا، ایک بار اٹھ کر تھوڑی دور چلنا چاہتے تھے، عصا کے سہارے اٹھے، مگر چند قدم چلے ہوں گے کہ چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا، ہاتھ سے عصا چھوڑ دیا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ساتھ تھے، انھوں نے پریشانی کا سبب پوچھا تو فرمایا عصا پر سہارا کیا تھا، اس لیے عتاب نازل ہوا کہ غیر کا سہارا لیتے ہو، اسی لیے عصا چھوڑ دیا اور محجوب ہوں، وہ فرماتے تھے کہ عبادت الٰہی سے عشق کی تکمیل ہوتی ہے، اس سے اسرار الٰہی معلوم ضرور ہوتے ہیں، لیکن ان کا ظاہر کرنا

Marfat.com

عشق کے منافی ہے،

لیکن آگے چلکر صوفیہ کرام میں عشق الٰہی کا غلبہ زیادہ ہو گیا، اور جب وہ اس کا اظہار کرنے لگے تو وحدۃ الوجود کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، خواجگان چشت کے ملفوظات میں عشق الٰہی کا ذکر تو جا بجا ہے جس میں وحدۃ الوجود کے رموز و نکات تلاش کیے جا سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ .... وحدۃ الوجود کی باضابطہ علمی بحث سب سے پہلے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے شروع ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے کہ عالم جو آئینۂ حیرت ہے اس کو نظر نہیں آتا، ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری ہوتی ہے، اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ اوست کہتے ہیں فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مرتبہ ہے جس کا نام الفناء عن الفناء ہے، اس مرتبہ میں سالک کو کمال استغراق میں اپنی فنائیت کی بھی خبر نہیں ہوتی، اور وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب سالک اپنے اور کل کائنات کو خدا کے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور اس کو خبر نہیں ہوتی ہے کہ کون اور کیا غرق ہوا، اس مقام تفرید میں پہنچکر سالک کو وحدۃ الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، اور وہ ایسا محو ہو جاتا ہے، کہ اس کو اسم و رسم، وجود و عدم، عبادت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، اور اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں ہوتا، اس جگہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے بطور انتباہ لکھا ہے کہ

توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ ہے اور خدا خدا ہے، اس لیے انا الحق سبحانی ما اعظم شانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں اور میری شان اس قدر بڑی ہے) وغیرہ کہنا کلمات کفر ہیں،

وحدۃ الوجود کی زیادہ تفصیلی بحث حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے یہاں ملتی ہے ان کے نزدیک ہمہ اوست ہی حقیقی توحید ہے، اور اس کو انھوں نے آیاتِ قرآنی احادیث نبوی اور دوسرے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اس مسئلہ پر اس دور میں جتنی بحثیں ہوتی رہیں، ان میں شریعت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا گیا مگر آگے چل کر اس کا رنگ کچھ اور ہو گیا،

حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، اور اپنے تقوی میں اُن تمام چیزوں سے پرہیز کرتے جن کی شرعی حیثیت ذرا بھی مشکوک ہوتی، وہ عام قصابوں کا ذبیحہ نہ کھاتے تھے، کیونکہ وہ عموماً نمازی نہ ہوتے تھے، لیکن جب وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہوئے تو ان پر اس کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ اس کو جزو ایمان سمجھنے لگے، اور اس کے منکر کو بد عقیدہ سمجھتے، لطائف قدسی میں ہے کہ ایک بار ان کے صاحبزادوں نے ان سے عرض کیا کہ وحدۃ الوجود کی کوئی تصریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں نہیں ملتی، اور ہم اس کو اپنے عقیدہ کا ایک جز بنائے ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت میں اس پر مواخذہ کیا جائے، حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ نے پہلے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے لڑکے وحدۃ الوجود کے منکر ہیں، تو علم معرفت میں بھی ناقص ہیں،

Marfat.com

اس لیے ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا، اور گنگوہ چھوڑ دینے کا قصد کر لیا، وہ گنگوہ تو نہ چھوڑ سکے لیکن اپنے لڑکوں کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی، ان پر وحدۃ الوجود کا جو غلبہ تھا، اس کا اظہار ان کے حسب ذیل مکتوب سے ہوتا ہے :-

"یہ کیسا شور ہے اور غوغا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی مومن ہے کوئی کافر ہے کوئی اطاعت کرنے والا ہے، کوئی گناہگار ہے، کوئی صحیح راستے پر ہے، کوئی غلط راہ پر چل رہا ہے کوئی مسلم ہے کوئی پارسا ہے، کوئی ملحد ہے، کوئی ترسا ہے سب ایک ہی لڑی کے موتی ہیں "

ان فقروں میں انسانی محبت، اخوت اور وحدت کا بڑا اور دبھرا ابہام ہے لیکن راہ سلوک کی منزلوں کو طے کر کے جس مقام پر حضرت عبدالقدوس گنگوہی پہنچ گئے تھے وہاں سے یہ درد بھری آواز نکل کر فضا میں گونجی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، لیکن بعض دنیادار اور خام صوفیہ اس مقام پر پہنچے بغیر نظری طور پر وحدۃ الوجود کے قائل رہے، اور مذہب و ملت، خیر و شر اور نور و ظلمت کی تفریق مٹانے کی کوشش میں بڑی افراتفری پیدا کر دی، اور توحید وجودی کی آڑ لیکر شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کرنے لگے، اور نظری طور پر یہ دلائل پیش کرتے کہ شریعت حقیقت کا چھلکا ہے، اور حقیقت شریعت کا گودا ہے، اور جب حقیقت حاصل ہو جائے تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، شریعت کے نافذ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ معرفت حاصل ہو، اور جب معرفت حاصل ہو جائے تو شریعت کی پابندی سے خود بخود آزادی حاصل ہو جاتی ہے، شرعی احکام کی پابندیاں صرف عوام کے لیے ہیں، خواص کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے نماز روزے کی ضرورت

Marfat.com

باقی نہیں رہتی، کیونکہ نماز کی بنیاد تو اس پر ہے کہ آدمی اور خدا دو جداگانہ چیزیں ہیں، اور اس ادا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیر و غیریت دور ہو، اور جب یہ غیریت دور ہو جائے تو پھر نماز کی پابندی بیکار چیز ہے، اسی طرح وہ عذاب و ثواب کے بھی منکر ہو گئے، اور کہتے کہ وہ وحدت سے نکل کر کثرت میں آئے اور غیر کثرت سے وحدت میں گم ہو جائیں گے تو عذاب و ثواب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، وہ یہ بھی کہتے کہ جب وہ وحدت میں گم ہو جاتے ہیں تو انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر ان کے مریدان کا سجدہ کریں تو ناجائز نہیں، اسی افراتفری میں وہ حسین و جمیل صورتوں کو پسند کرتے اور کہتے کہ حسن و جمال حضرت واجب الوجود سے مستعار ہے، اسی لیے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کے ایسا رنگ دیکھتے، اور حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے،

علماء ان تمام باتوں کو بدعت اور گمراہی قرار دیتے اور ان پر عقیدہ رکھنے والوں کو بزرگ ماننے کے بجائے خارج از اسلام سمجھتے، وہ صرف لا الہ الا اللہ کے ماننے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ کے بھی قائل نہ ہوتے، کیونکہ نہ صرف ان کی بلکہ شریعت کے پابند صوفیہ کی بھی دلیل تھی کہ خود خداوند تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (یعنی اے محمد! تم لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری اتباع کرو، یعنی میرے افعال، اقوال، اور احوال کی پیروی کرو، پس اللہ تم کو دوست رکھے گا)، اسی لیے علماء توحید اور رسالت

دونوں پر یقین کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو، اسی متابعت کے ذریعہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے، وہ انا الحق کے کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے، اور سلاطینِ وقت سے مل کر ان کو قتل یا جلاوطن کرا دیتے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے،

حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک برگزیدہ عالم بھی تھے اور عارف باللہ بھی اس لیے انھوں نے وحدۃ الوجود کے منکر ہونے کے بجائے اس کے فلسفہ میں بڑی وضاحت پیدا کی، اور وحدۃ الوجود کا ازالہ وحدت شہود کی بحث سے کر دیا؛ انھوں نے خود راہ سلوک میں اُن تمام منزلوں کو بھی طے کیا تھا، جہاں عام صوفیوں کا طائر خیال بھی نہیں گیا تھا، اسی لیے اپنے مشاہدات اور مکاشفات کی بنا پر یہ بتایا کہ جس مقام پر جاکر صوفیوں کو وحدت وجود محسوس ہوتی ہے، وہ سلوک کی آخری منزل نہیں بلکہ درمیانی منزلوں کی واردات ہیں، جہاں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس میں ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں، لیکن آگے بڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ محض وحدت شہود ہے، یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے، وحدت وجود نہیں، یعنی واقع میں ایسا نہیں ہے، اس وحدت شہود کے بعد عبدیت کا مقام آتا ہے، جہاں پہنچکر خالق کائنات کی جداگانہ حقیقتیں روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہیں، اسی لیے مقام عبدیت اور ایمان بالغیب دونوں حضرت مجدد الف ثانی کے یہاں ایک ہی ہیں،

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خیالات کو پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا

اور طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کیں، مثلاً ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ توحید شہودی یہ ہے کہ ایک ذات کے سوا کچھ اور مشہود نہ ہو، اور توحید وجودی یہ ہے کہ ایک موجود کو جاننے کے بعد اس کے غیر کو نابود سمجھا جائے اور غیر کو نامعلوم جاننے کے باوجود اس کا محض مظہر اور جلوہ خیال کیا جائے، توحید وجودی علم الیقین کی قسم سے ہے اور توحید شہودی عین الیقین ہے، مثلاً کسی کو آفتاب کا علم ہے تو یہ علم آفتاب ستاروں کے وجود کو بے وجود نہیں کر سکتا، اور جو عین آفتاب کو دیکھتا ہے اس کی نگاہ عین الیقین میں ستاروں کا وجود نیست و نابود ہے، مقام عین الیقین سے حق الیقین میں پہنچنا کوئی تضاد نہیں، اور یہ عین علم شریعت ہے،

علماء وحدۃ الوجود کے ماننے والے کو کافر اور زندیق کہتے اسطرح صوفیہ اور علماء میں مسئلہ وحدۃ الوجود میں جو اختلاف تھا، اس کو حضرت مجددؒ نے دور کرنے کی بھی کوشش کی اور اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ جو لوگ وحدت وجود کے قائل ہیں اور اشیاء کو عین حق جانتے ہیں، اور ہمہ اوست کہتے ہیں، ان کی یہ مراد نہیں ہے کہ اشیاء حق تعالیٰ کے ساتھ متحد ہیں، اگر وہ یہ سمجھتے ہیں، تو یہ کفر، الحاد، زندقہ اور گمراہی ہے، کیونکہ واجب ممکن نہیں ہو سکتا، اور بے چون وچون نہیں ہو سکتا، ہمہ اوست کے معنی یہ ہیں کہ اشیاء نہیں ہیں، بلکہ حق تعالیٰ موجود ہے، منصور نے جو انا الحق کہا تو اس سے یہ مراد نہیں کہ میں حق ہوں اور حق کے ساتھ متحد ہو گیا ہوں، بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ میں ہوں، حق تعالیٰ موجود ہے، انھوں نے غلبۂ حال میں اپنے اور خلق کے وجود کو نہ دیکھا، صرف ایک ذات رب کی دیکھی، اگر اپنی ذات دیکھتے اور یہ الفاظ کہتے تو کفر تھا، حضرت مجددؒ اس تشریح کے بعد فرماتے ہیں کہ صوفیہ اشیاء کو حق تعالیٰ کی ظہورات جانتے ہیں اور ان کو حق تعالیٰ کی اسماء و صفات سمجھتے ہیں اشیاء حق تعالیٰ

سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو آدمی کے ساتھ اس کا سایہ رکھتا ہے، کسی آدمی کے سایہ کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ آدمی کے ساتھ متحد ہے، اور یہ عینیت کی نسبت رکھتا ہے، سایہ آدمی کی اصل کو بدلتا نہیں ہے، وہ محض آدمی کا ظہور ہے، اسی طرح صوفیہ کے نزدیک اشیا حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں نہ کہ عین، اسی لیے ہمہ اوست کے معنی ہمہ از دست ہیں، جیسے سایہ آدمی سے ہے، نہ کہ عین آدمی ہے، اور ہمہ از دست کو علماء بھی تسلیم کرتے ہیں، اس صورت میں صوفیہ اور علماء میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا،

حضرت مجددؒ نے اس بحث کا ازالہ تو عارفانہ رنگ میں کیا، لیکن عالمانہ رنگ میں اس پر زور دیا کہ سالک ہو یا عارف جب تک وہ اپنے عقائد اور اعمال میں کتاب وسنت کا پابند نہیں ہے، وہ قابل تقلید نہیں، اور جن صوفیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمہ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے، ان کا متبع ہرگز نہ کیا جائے، ان کے نزدیک شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے، فرماتے ہیں کہ جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے، وہ بھی قابل تقلید نہیں، اور جو عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے، وہ جاہل ہیں، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہیں تو ایسے تمام علوم کا حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے،
حضرت مجددؒ نے ان مباحث کو کچھ ایسے موثر انداز میں پیش کیا کہ بعض خام صوفیہ نے وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں جو فتنہ انگیزیاں پیدا کر رکھی تھیں وہ دب کر رہ گئیں۔
البتہ عالمگیری دور میں دارا شکوہ نے توحید وجودی کو ایک دوسرے رنگ میں

Marfat.com

پیش کرنا شروع کیا، اس نے اپنے رسالہ حسنات العارفین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب کہ ایک سالک شریعت کفر، ایمان، خیر و شر، عبد اور معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور بے خودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ قابلِ مواخذہ نہیں، اور وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ خود اس کی زبان سے شطحیات صادر ہوتے ہیں اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا لیکن راسخ العقیدہ علماء نے یہ کہکر اس کی مخالفت کی کہ کچھ شطحیات ایسی ضرور ہیں جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں سے غیر اختیاری طور پر نکلیں، لیکن وہ خود دارا شکوہ کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے،

اور جب دارا شکوہ نے مجمع البحرین لکھی تو علماء کے حلقہ میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی، وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کے موحدوں کے اشغال کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں، لیکن بہترین شغل اجپا ہے جو ہر مذہب و ملت کے لوگ خواب اور بیداری میں بلا قصد اور بے اختیار ہو کر برابر جاری رکھتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے، ان من شیئ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (اور کوئی چیز نہیں جو نہ پڑھتی ہو خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا ۱۵۔ بنی اسرائیل، رکوع ۵) اسی طرح ہندوستان کے موحد سانس کے اندر جانے اور باہر آنے کو دو لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں، جو سانس باہر آتی ہے اس کو او اور جو سانس اندر جاتی ہے اس کو من، یعنی اومنم کہتے ہیں، صوفیہ اس کو ھو اللہ کہتے ہیں، اور یہ غیر ذی حیات کی سانس کے ساتھ ہے،

Marfat.com

اسی طرح دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ برہما، بشن اور مہیش، جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل ہیں، برہما جبرئیل کی طرح ایجاد بشن میکائیل کی طرح بقا، اور مہیش اسرافیل کی طرح فنا کے موکل ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفات ان ہی تینوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں، صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی دو ہی صفتیں ہیں، جمال اور جلال، لیکن ہند دفقرار کے یہاں تین صفتیں (ترگن) ہیں، ست (ایجاد) رج (بقا) تم (فنا) اسی طرح دارا شکوہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ روح اور آتما، ابوالارواح اور پرماتما، ناسوت اور جاگرت، ملکوت اور سپن، جبروت اور سکھوپت، لاہوت اور تریا، اسم اعظم اور بید مکھ، اللہ اور ادم فرشتہ اور دیوتا، مظہر اتم اور اوتار، فردوس اعلیٰ اور بیکنٹھ، قیامت کبریٰ، اور مہاپرلی، رستگاری اور مکت، عالم کبیر اور برہماند، حوران بہشت اور اپچھرا، طوبیٰ اور کلپ برچھ وغیرہ ایک ہیں، دارا نے یہ دکھا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تصوف اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں، حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں،

اسی حقانیت کی تلاش میں دارا شکوہ نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا، اور اس کا خود بیان ہے کہ اس کو علم توحید توریت، انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ ان میں توحید کا بیان مجمل ہے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہوسکی، کیونکہ اس کی اکثر باتیں رمزکی ہیں، آخر اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں، جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے

(علماء

Marfat.com

فارسی میں کر کے عام کیا، اور وہ اس کا اس قدر قائل ہو گیا کہ وہ اسکو کتاب قدیم پہلی آسمانی کتاب، بحر توحید کا سرچشمہ، قرآن مجید کی اصل اور کتاب مکنون قرار دیتا ہے، اور پھر اس نے یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ہمہ اوست یا ہمہ از دست یا ہمہ در دست کا جو خیال صوفیہ میں مقبول ہے، وہ ان ہی اپنشدوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، اس نے بھگوت گیتا اور جگ بشسٹ کے فارسی ترجمے ان ہی موحدانہ خیالات سے متاثر ہو کر کیے اور وہ رام چندر جی اور بشسٹ جی کی روحانیت کا بھی قائل ہو گیا،

دارا اپنی اس وسیع المشربی کی وجہ سے ہندوؤں میں خصوصاً شاہجہانی دربار کے راجپوت سرداروں میں بہت مقبول ہو کر ان کا ہیرو بن گیا، لیکن علمار جو کتاب اور سنت کی جامد تقلید کے قائل تھے، ان باتوں کو پسند نہ کر سکے، ان کی اور ان کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمانوں کی نظریں اورنگ زیب کی طرف اٹھیں، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر تھا، اور شریعت کا پابند ہونے کی امکانی کوشش کرتا رہتا تھا، وہ مسلمانوں کا ہیرو بن گیا، اور جب وہ دکن سے جنگ جانشینی کے لیے روانہ ہونے کو تھا، تو حضرت شیخ برہان کی خدمت میں برہانپور حاضر ہوا، شیخ برہان بادشاہ اور امرار سے ملنا پسند نہ کرتے تھے، اس لیے اورنگ زیب پہلے بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک نووارد کو دیکھ کر شیخ برہان نے اس سے نام پوچھا، اس نے اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، نہ اور لوگوں کی طرح اس کو کوئی تبرک دیا، لیکن وہ دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے

تو دے لو، ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، مگر تیسرے دن اورنگ زیب پھر ان کے پاس گیا، وہ نماز کے لیے اپنی خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے، کہ اورنگ زیب مودبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھکو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا، آپ باطنی توجہ فرمائیں، شیخ برہان نے فوراً کہا، ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے، تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اورنگ زیب سے کہا بادشاہی مبارک ہو،

دارا شکوہ اگر موحد بننے پر اکتفا کر لیتا تو اپنی وسیع المشربی اور رواداری کی وجہ سے کبیر، جے دیو، رامانج اور چتین وغیرہ کی صف میں نمایاں جگہ پالیتا، لیکن اپنے کو موحد اور عارف باللہ ظاہر کرنے کے ساتھ وہ عام تیموری شہزادوں کی طرح درباری سیاست کا بھی کھیل کھیلتا رہا، اور آخر میں آگرہ میں بیٹھ کر حصولِ تخت و تاج کے لیے دھرمادت کی جنگ کرائی، اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو سموگڈھ کی لڑائی میں فوج کی رہبری خود کی، ان دونوں لڑائیوں میں راجپوت جس پامردی، اور شجاعت سے اس کی خاطر لڑے وہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے لیکن ایک بہت بڑے گروہ کا یہ خیال ہے کہ راجپوتوں کی یہ جانبازی اور جلادت شاہجہاں کے بڑے لڑکے سے زیادہ مجمع البحرین کے مصنف، اپنشد بھگوت گیتا اور یوگ بشسٹ کے مترجم، اور رام چندر جی اور بشسٹ کے معتقد کے خاطر تھی، لیکن دیر و حرم کی تفریق مٹانے والا دارا مغلوب ہوا، اورنگ زیب غالب ہو کر ہندوستان کا شہنشاہ بنا،

تو دارا علماء اور فقہاء کے فتوے کے مطابق نذر شمشیر کر دیا گیا، ایک گروہ کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر دارا تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت باقی رہتی، لیکن جس گروہ نے اورنگ زیب کو اپنا ہیرو بنا لیا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ دارا کی تخت نشینی سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی، لیکن اسلام ختم ہو گیا ہوتا، اورنگزیب کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو ختم ہو گئی، لیکن اسلام باقی رہ گیا، اور یہ ہندستان کی تاریخ کا بڑا دردناک پہلو ہے، کہ اورنگ زیب کی مخالفت میں غیر مسلم مورخوں نے اپنی تحقیقات ایک ڈھیر لگا دیا ہے، لیکن جتنا زیادہ اس کو برا دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اتنا ہی وہ عام مسلمانوں کی نظروں میں محبوب ہوتا جا رہا ہے، اور اب وہ اس کو ایک مذہبی پیشوا سمجھنے لگے ہیں، جس کے خلاف کسی قسم کی نا روا بات سننے کے لیے تیار نہیں "

شاہ ولی اللہ اور توحید وجودی عالمگیری عہد میں دارا شکوہ اور سرمد کے قتل کے بعد توحید وجودی کا جھگڑا دب کر رہ گیا، آگے چل کر کچھ ابھرا تو توحید وجود اور توحید شہود پر پھر بحث شروع ہوئی، لیکن اس جھگڑے کو شاہ ولی اللہؒ نے چکایا، وہ عالم بھی تھے، اور صوفی بھی، ان کا شرارۂ علم ان کے نور باطن سے چمکا تو انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان محض نزاع لفظی اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وحدۃ الوجود کا مسئلہ عملی زندگی میں غیر موثر ہو کر رہ گیا، اور وہ شاعروں یا بعض صوفیہ کے یہاں ایک نظری اور روایتی چیز بن کر رہ گیا،

سماع کا جھگڑا وحدۃ الوجود کے مسئلہ کے بعد علماء اور صوفیہ میں جو چیز سب سے زیادہ،

متنازعہ فیہ رہی وہ سماع تھا، چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کے یہاں سماع ان کی عبادت وریاضت کا ایک جزو بن گیا تھا، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر محفلِ سماع میں غیر معمولی کیفیت طاری رہتی اور وہ بعض اشعار سنکر کئی روز تک بیہوش رہتے، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ ایک بار کچھ اشعار سنکر سات روز تک مسلسل بیہوش رہے، نماز کے وقت ہوشیار ہو جاتے، لیکن نماز ادا فرماکر پھر بیہوش ہو جاتے، ان کا وصال بھی سماع کی بدولت ہی ہوا، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ پر بھی سماع کے وقت عجیب کیفیت طاری رہتی، اور وہ بھی کچھ اشعار سنکر ایک بار سات دن اور سات رات تک عالمِ سُکر میں آرہے وہ تو بے چین ہو کر رقص بھی کرنے لگتے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے کہ سماع سے تحریک تلب ہوتی ہے، اور اس تحریک سے بڑی بڑی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، عالم ملک سے انوار ارواح پر اور عالم جبروت سے احوال قلوب پر اور عالم ملکوت سے آثار جوارح پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحیٰی منیریؒ کے یہاں بھی محفل سماع ہوتی، لیکن ان پر جب کبھی وجد طاری ہوجاتا تو خلوت میں چلے جاتے، دروازہ بند کر لیتے وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ دیتے، سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت بہاءالدین ذکریا ملتانیؒ بھی سماع سے شغل فرماتے تھے،

ان تمام بزرگان دین کی سماع کی محفلوں میں بڑی احتیاط برتی جاتی، اور ان میں غیر معمولی قسم کے آداب ہوتے، مثلاً چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا یہ مسلک تھا کہ محفل سماع میں سنانے والا امرد اور عورت نہ ہو، اور جو چیز سنائی جائے، وہ فواحش سے پاک ہو، اور جو سنے صرف خدا کے لیے سنے، سماع کے وقت مزامیر نہ ہوں حضرت شرف الدین یحیٰی منیریؒ

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ مجلس سماع میں جو شریک ہوں وہ درویش یا درویش کے دوست ہوں، اور اس میں شرکت کے وقت دل تمام چیزوں سے پاک ہو، اور دل حق سبحانہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور طرف مائل نہ ہو،

لیکن ان تمام شرائط کے ساتھ بھی سماع علمار کی نظروں میں حرام رہا، اور وہ صوفیہ کے اس شغل پر اعتراض کرتے رہے، ایک روز حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے سامنے اس کی حلت و حرمت پر گفتگو ہو رہی تھی تو فرمایا کہ سبحان اللہ! کوئی جل کر راکھ ہو جائے اور دوسرے ابھی اختلاف ہی میں ہوں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ سماع ان ہی لوگوں کے سامنے جائز ہے جو اس میں ایسے مستغرق ہوں کہ ایک لاکھ تلوارین بھی ان کے سر پر ماری جائیں یا ایک ہزار فرشتے بھی ان کے کان میں کچھ کہیں تو بھی ان کو خبر نہ ہو، لیکن علمار ان باتوں سے مطمئن نہ ہوتے، اور وہ صوفیہ سے سماع کے مسئلہ پر برابر الجھتے رہتے، حضرت حمیدالدین ناگوریؒ سماع کے بڑے دلدادہ تھے، ان کی وجہ سے دہلی میں سماع کی محفلیں برابر ہوتی رہتیں، سلطان شمس الدین التتمش کے دربار کے مفتیوں کو یہ بدعت پسند نہ تھی، اس لیے انھوں نے التتمش پر زور دے کر خواجہ حمیدالدین ناگوریؒ کو ایک محضر میں دربار طلب کیا، اور جب بحث شروع ہوئی تو حضرت حمیدالدین ناگوریؒ نے بہت ہی موثر انداز میں کہا کہ یہ اہل قال کے لیے حرام اور اہل حال کے لیے مباح ہے، اس بحث سے التتمش تو مطمئن ہو گیا، لیکن دربار کے مفتی قائل نہ ہو سکے، اسی طرح حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیریؒ نے فرمایا ہے کہ سماع اہل حق کے لیے مستحب، اہل زہد کے لیے مباح اور اہل نفس کے لیے مکروہ ہے، سماع اگر طلب منفعت کے لیے ہے، تو یہ مذموم ہے اور اگر طلب حقیقت کے لیے ہے تو محمود ہے،

Marfat.com

اس سلسلہ میں علمار وصوفیہ کے اختلافات کا دردناک پہلو اس وقت ظاہر ہوا جب کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کے فیوض سے دہلی کے بدکار اپنی بدکاری سے باز آرہے تھے، بے نمازی نماز کے پابند ہو رہے تھے، بددیانت بدیانتی اور بدمعاملگی کو چھوڑ رہے تھے، سود خواری ذخیرہ اندوزی بند ہوگئی تھی، خواص اور عوام کے دلوں میں گناہ کا خوف غالب ہوگیا تھا، حتیٰ کہ شاہی خاندان کے افراد فسق وفجور سے پرہیز کرنے لگے تھے، اس وقت بھی علمار کا ایک گروہ حضرت شیخ نظام الدین اولیارؒ سے سماع کی حلت وحرمت پر اتنا الجھا کہ ان کو سلطان غیاث الدین تغلق کے سامنے ایک محضر میں حاضر ہوکر اپنے مذہبی عقائد کی وضاحت کرنی پڑی، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کا بیان ہے کہ اس محضر میں دہلی کے فقہار ان کی عداوت اور حسد سے بھرے ہوئے تھے، اور جب وہ نفس غنا کے جواز میں حدیثیں پیش کرتے تو علماے احناف کہتے کہ تم مقلد ہو، تم کو حدیث سے کیا مطلب ہے، اگر فقہ حنفی کی روایت ہو تو پیش کرو، یہ سن کر حضرت خواجہ فرماتے کہ وہ شہر کیونکر آباد رہے گا، جہاں لوگوں کی راے کو احادیث نبوی پر ترجیح دی جاتی ہو، لیکن اس محضر میں حضرت شیخ بہار الدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدین حکم بنائے گئے تھے، وہ اپنے زمانے کے جید عالم تھے، انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کے دلائل کو سنکر سماع کی اباحت میں فیصلہ دیا، اور سلطان غیاث الدین تغلق نے اس فیصلہ کو تسلیم کرکے حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا،

لیکن علمار پھر بھی مطمئن نہ تھے، اور وہ معترض رہے، ایک بار حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کو ایک مجلس میں حسب ذیل شعر پر وجد آیا،

Marfat.com

جفا بر عاشقاں گفتی نخواہم کردہم کردی　　قلم بر بے دلاں گفتی نہ خواہم راندہم راندی

اس زمانہ کے ایک عالم مولانا مغیث تھے، جو شاعر بھی تھے، انھوں نے ایک رسالہ میں لکھ کر یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں کوئی بات نہیں ہے، اگر جور وجفا کی نسبت خداوند تعالیٰ کی جانب کی جائے تو یہ کفر ہے، اور اس قسم کے اور اعتراضات تھے، یہ رسالہ حضرت چراغ دہلویؒ کی خدمت میں بھی پیش کیا، اور انھوں نے اس کو پڑھا، اور واپس کر دیا کچھ دنوں کے بعد ایک اور مجلس میں ان کو حسبِ ذیل اشعار پر بے قراری ہوئی،

ماطبلِ مغانہ در دش بے باک زدیم　　عالی علمش برسرِ افلاک زدیم

از بہرِ یکے مغ بچہٴ می خوارہ　　صد بار کلاہ توبہ برخاک زدیم

اس بے قراری کے عالم میں چھت پر تشریف لے گیے اور مولانا مغیث کو بلایا اور جب وہ سامنے آئے تو فرمایا، مولانا لکھو کہ اس سے میرا کیا جہل ثابت ہوتا ہے،

لیکن علمار کا اعتراض ایک حد تک صحیح تھا، اکابر صوفیہ جس کیفیت کے ساتھ محفل سماع میں شریک ہوتے، وہ عام صوفیہ میں لازمی طور پر نہیں ہوتی، اور افراتفری پیدا ہو جاتی، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیارؒ کے زمانے میں بعض خانقاہوں میں محفل سماع پورے شرائط کے ساتھ نہ ہوتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیآر کے ملفوظات میں ہے کہ ان کے مریدوں میں سے ایک نے گذارش کی کہ آج کل بعض خانقاہوں میں درویش چنگ ورباب ومزامیر کی محفل سماع میں رقص کرتے ہیں، یہ سن کر حضرت خواجہ نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے، کیونکہ جو فعل نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے، ایک مرید نے عرض کی کہ یہ درویش جب محفل سے باہر آتے ہیں، اور ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسی محفل میں کیوں شریک ہوئے، جہاں مزامیر تھے، اور وہاں

Marfat.com

کیوں رقص کیا، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم سماع میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی کہ اس جگہ مزامیر بھی ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ جواب درست نہیں، اور یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں،

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ مزامیر کے ساتھ سماع سننا پسند نہیں فرماتے اور فرماتے کہ اوّل تو سماع ہی میں علمار کا اختلاف ہے، اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ اس کو مباح کیا گیا ہے لیکن مزامیر تو بالاتفاق حرام ہیں، آگے چل کر سماع کے ساتھ مزامیر لازمی ہو گئے، اور اس کی روحانی کیفیات کم ہوتی گئیں، اور یہ محض سرود و نغمہ کی ایک مجلس بن گئی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے زمانے کی ایک مجلس سماع کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ سماع کے وہ شرائط جو مستقیم الاحوال بزرگوں کی کتابوں مثلاً عوارف المعارف وغیرہ میں مفصل درج ہیں، اُن میں سے اکثر اس وقت کے لوگوں میں مفقود ہیں، بلکہ اس قسم کا سماع و رقص اور مجلس و اجتماع جو آج کل کے لوگوں میں مروج ہے، کچھ شک نہیں کہ مضر محض اور منافی صرف ہے، سماع سے مدد و اعانت کا حاصل ہونا مفقود ہے، اور مضرت و منافات موجود، پھر ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنے اضطراب و بے قراری کی تسکین سماع و نغمہ اور وجد و تواجد میں ڈھونڈھتے ہیں اور اپنے مطلوب کو نغمے کے پردہ میں مطالعہ کرتے ہیں، اسی لیے انھوں نے رقص و رقاصی کو اپنی عادت بنا لیا ہے، حالانکہ انھوں نے سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام میں شفا نہیں رکھی، اگر نماز کے کمالات کی حقیقت کچھ بھی ان پر منکشف ہو جاتی تو ہرگز سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے، ع

Marfat.com

چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

علماء کی مخالفت کے باوجود بہت کم ایسی خانقاہیں ہوں گی جہاں سماع کی مجلسیں مزامیر کے ساتھ نہ ہوتی ہوں، اور ہندوستان کے ماحول میں یہ افادیت سے خالی نہ رہا، ہندوؤں کی ہر مذہبی اور معاشرتی تقریب میں سرود و نغمہ ضرور رہتا، بلکہ ان کے مذہب کا یہ لازمی جزبن گیا تھا، اسی لیے وہ صوفیہ کی مجالس سماع کی طرف خواہ مخواہ مائل ہوئے اور شاید ان ہی کی تسکین کی خاطر ان مجلسوں میں ہندی دوہے بھی گائے جانے لگے، جن سے خود صوفیہ کو بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی، اور انھوں نے بھی دوہے کہنے شروع کیے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت عبدالحق ردولویؒ، اور حضرت عبدالقدوسؒ کے دوہے مشہور ہیں، یہ دوہے ہندی راگ میں گائے جاتے اور ہندی راگ صوفیہ کو اسقدر پسند آئے کہ انھوں نے خود بھی کچھ راگ اختراع کیے، راگ درپن میں ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے دھناسری، ٹوڑی اور مالسری کو مخلوط کرکے ملتانی دھناسری ایجاد کی جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اپنی محفلوں میں بہت پسند کرتے تھے، قوالی کی ایجاد تو امیر خسرو ہی سے منسوب ہے، اور پھر انھوں نے ایرانی اور ہندوستانی نغموں کو ملاکر بہت سے نئے راگ اور راگنیاں ایجاد کیں، مثلاً ان کے ایجاد کردہ ایمن میں ہنڈول اور نیریز ملے ہوئے ہیں، عشاق میں سارنگ، بسنت اور نوا کے راگ ہیں، موافق میں ٹوری، مالوی، دوگاہ اور حسینی ملے ہوئے ہیں، فرغنہ میں کنگلی اور گوری کو ملایا ہے، وغیرہ وغیرہ،

قبر پرستی مسلمان عوام، علماء، اور صوفیہ کے اختلاف کو نظر انداز کرکے ان کے فقہی مباحث سے زیادہ دلچسپی نہ لیتے، اور وہ عموماً صوفیۂ کرام کی کرامتوں اور روحانی طاقتوں

کو دیکھ کر ان کے گرد پروانہ وار جمع رہتے، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کو زندہ سمجھتے۔ اس طرح ان متوفی بزرگوں کی حکومت برابر جاری رہتی، علمار کا ایک گروہ اس قبر پرستی کے خلاف ہمیشہ رہا، لیکن عوام اس مخالفت سے کبھی متاثر نہیں ہوئے، اور صوفیہ کی قبریں ابھی تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں، اور ہندو بھی مسلمانوں ہی کی طرح ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، اور نذریں چڑھاتے ہیں،

یہ قبر پرستی مذہبی لحاظ سے تو کسی طرح جائز قرار نہیں دی جا سکتی، لیکن ہندوستان کا جو مذہبی ماحول تھا، اس میں اس بدعت کا ایک روشن پہلو حسب ذیل لطیفہ سے ظاہر ہوتا ہے، اکبری عہد میں راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک سید اور ایک برہمن میں مذہبی بحث چھڑ گئی، دونوں اپنے اپنے مذہب کی فضیلت بیان کرتے رہے، لیکن کوئی دوسرے کو قائل نہ کر سکا، آخر میں مان سنگھ پر فیصلہ چھوڑ دیا گیا، اس نے کوئی فیصلہ دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ اگر میں مذہب اسلام کو ترجیح دوں تو لوگ بادشاہ وقت کی خوشامد پر محمول کریں گے، اور اگر اس کے برعکس رائے دوں تو تعصب سمجھا جائے گا، لیکن جب اس سے اصرار کیا گیا تو کہا مذہبی حقایق کی بنا پر تو فیصلہ دینا مشکل ہے، لیکن یہ دیکھتا ہوں کہ ہندوؤں میں خواہ کیسا ہی گنوان پنڈت یا دھیانی فقیر ہو، مرنے پر جلا دیا گیا، اس کی خاک اڑ گئی، رات کو وہاں کوئی جاتا ہے تو آسیب کا خطرہ محسوس کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کے جس شہر یا قصبہ یا گاؤں میں گذرو بزرگ پڑے سوتے ہیں، ان کے مزار پر چراغ جلتے ہیں، پھول پھکتے ہیں، چڑھاوے چڑھتے ہیں، اور لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں،

لیکن آگے چل کر اس قبر پرستی میں شرک کی بو آنے لگی، عوام بزرگوں کی قبروں پر جا کر جانور چڑھا کر ان کی قربانی کرتے، مدار صاحب اور سید سالار کی قبروں کی زیارت کو

Marfat.com

فریضۂ حج کے برابر سمجھتے، اور بعض بزرگوں کی قبروں کو چومتے اور ان کے سامنے سجدہ کرتے، عورتیں پیروں کے نام پر روزے رکھتیں، اور اپنی حاجت برآری کا ذریعہ سمجھتیں اور رفتہ رفتہ یہ بزرگ واقعی حاجت روا اور مشکل کشا سمجھے جانے لگے، علماء نے ان بدعتوں کی مخالفت پورے طور پر کی، اور ان میں مبتلا ہونے والے تمام لوگوں کو بدعتی قرار دیا، حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ عالم بھی تھے، اور صوفی بھی، وہ بھی بدعتیوں کی بدعتوں سے برگشتہ خاطر تھے، تقویۃ الایمان میں تحریر فرماتے ہیں۔

قبر کی زیارت کرنی جائز اور مباح ہے، اور جس زیارت سے کہ نہ دنیا کی رغبت کم ہو اور نہ آخرت کی یاد آوے وہ زیارت درست نہیں، پھر جو کوئی قبر کی زیارت کے واسطے جاوے کہ وہاں نماز پڑھے اور قبر کا طواف کرے یا اس کا بوسہ دے یا اپنے رخسار اور چھاتی کو قبر پر ملے اور ان مردوں کو پکارے اور ان سے مدد مانگے یا وہاں چادر، شامیانہ، نقارے، کھانا مٹھائی چڑھاوے یا لڑکیوں یا لڑکوں اور عورتوں کو لے جاوے، یا وہاں روشنی، مجلس اور میلاد کرے، یا اور کچھ خرافات کرے سو وہ بدعتی ہے، یا مشرک یا مرتکب مکروہ اور فعل حرام کا، سو اس زمانہ میں اکثر لوگ قبروں پر ان ہی کاموں کے واسطے جاتے ہیں، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت یاد کرنے کوئی نہیں جاتا، بلکہ دنیا ہی کی رغبت کے سبب سے جاتے ہیں اور جو کوئی منع کرے تو وہی تباہی دلیلیں اس کے مقابلے میں لاتے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ بعض دنیا طلب مولوی اور نام کے عاقبت سلب مشائخ قبروں پر جا کر بیٹھنے لگے، عرس کرنے لگے، روشنی، راگ وہاں ہونے لگا، ریوڑی، گٹا، حلوا، شیرمال

Marfat.com

چڑھنے لگا، چادریں مفت آنے لگیں، اور عورتیں جوان، بڑھیا جانے لگیں، نوبت، نقارہ بجنے لگے، نذر و نیاز کا روپیہ پیسہ جمع ہونے لگا، مولوی، مجاور، مشائخ پوجے جانے لگے، تب انھوں نے عوام جاہلوں کو خراب کرنے کو دو چار ادھر ادھر کے قصے کہانی ان قبر والوں کی بنا لیں، دو ایک روایتیں جھوٹی سچی نکال لیں، دو تین حدیثیں اپنے مطلب پر لگا لیں، اس طرح انھوں نے اپنی دنیا کو تو تباہ کیا اور دوسروں کی عاقبت کو بھی تباہ کیا، بلکہ اپنا روسیاہ کیا، پھر اب کے لوگ ان کے کام اور بات کی سند پکڑنے لگے، حالانکہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے سوا کسی کی سند پکڑنا نہ چاہیے"

علمار اور صوفیہ کی مصالحت علمار عام طور سے دنیادار اور نام نہاد صوفیہ پر اعتراضات کرتے رہے، لیکن ان کے اعتراضات تمام صوفیہ پر سمجھے جانے لگے، اس سے عوام کے ذہن میں یہ انتشار پیدا ہو جاتا کہ علمار اور صوفیہ دو علیحدہ چیزیں ہیں، لیکن ان کا یہ انتشار اُس وقت دور ہو جاتا جب علمار اور صوفیہ ایک دوسرے کے سامنے جھکتے رہتے، ایسی مثالوں کی کمی نہیں،

حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے خلفار میں مولانا مظفر بلخی بڑے مشہور خلیفہ گزرے ہیں، بلخ کے ایک شاہی خاندان سے تھے، راہ سلوک میں گامزن ہونے سے پہلے ان کو اپنے علم پر بڑا غرور تھا، اور مشائخ سے الجھتے رہتے، حضرت مخدوم الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اپنی کچھ علمی مشکلات ان کے سامنے پیش کیں، حضرت مخدوم الملک ان کا جواب دیتے تو مولانا مظفر بلخی کہتے لا نسلم (میں تسلیم نہیں کرتا ہوں) وہ جس قدر الجھتے اسی قدر حضرت مخدوم الملک ان سے اخلاق سے پیش آتے رہے،

Marfat.com

یہاں تک کہ مولانا مظفر کی ساری مشکلات حل ہوگئیں، ان کو اپنا علم ہیچ معلوم ہونے لگا، اور حضرت مخدوم الملکؒ سے متاثر ہوا کر اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے لیکن حضرت مخدوم الملکؒ نے ان سے فرمایا کہ راہ طریقت علم کے بغیر طے نہیں ہوتی ہے اور اب تک انھوں نے جو علم حاصل کیا ہے، وہ جاہ و منزلت کے لیے تھے، جو ان کے لیے بار آور نہ ہو سکے گا، اب وہ پھر سے خلوص نیت سے اللہ کے واسطے علم پڑھیں، تاکہ راہ سلوک میں ان کو ترقی حاصل ہو، یہ سن کر وہ علم کی تلاش میں پا پیادہ اٹھ کھڑے ہوئے، راستہ میں ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے، تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، اتفاقاً حضرت مخدوم الملکؒ کے ایک دوسرے مرید دہلی سے علم حاصل کرکے واپس آرہے تھے، مولانا مظفر کی کیفیت دیکھ کر ان کو اپنا گھوڑا دیدیا، اور ان کو اعزاز و اکرام کے ساتھ دہلی پہنچوا دیا، دو سال تک وہاں علم حاصل کرتے رہے، فیروز شاہ تغلق نے انکی شہرت سنکر ان کو اپنے ایک کوشک میں درس و تدریس کی خدمت سپرد کی، کچھ دن وہاں رہے ہونگے کہ ایک دن کچھ مطربوں کی آواز سن کر ایسے بے خود ہوئے کہ کوشک کے اوپر سے نیچے کود گئے، اور اسی حال میں حضرت مخدوم الملکؒ کے پاس جانے کے لیے چل کھڑے ہوئے، وہاں پہنچے تو ان کے علم کا پندار ختم ہو چکا تھا، لیکن مرشد نے ان کے نفس کو کچلنے کے لیے خانقاہ کے درویشوں کی خدمت کے لیے مامور کیا، اور مولانا مظفر کو اس خدمت کو انجام دینے میں اور بھی زیادہ خوشی ہوئی، ان کے جسم پر کپڑے پھٹ کر تار تار ہو جاتے تو ان میں گرہیں ڈال لیتے، یا سی لیتے، خود حضرت مخدوم الملکؒ نے ایک روز دیکھا کہ ان کے کپڑے پھٹ کر پارہ پارہ ہو گئے ہیں، اور ان کے چہرہ سے خواری یعنی عاجزی اور مسکینی ظاہر ہوتی ہے، پھر بھی خوش ہیں اور زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں ۔

Marfat.com

خوشم بدولت خواری و ملک تنہائی
کہ التفات کسے را بروزگارم نیست

مخدوم الملکؒ نے یہ دیکھ کر ان کو اچھے کپڑے اور اچھے کھانے دیے، لیکن وہ کسی اور عالم میں پہونچ چکے تھے،

جانِ آدم چوں بہ سرّ فقر سوخت
ہشت جنّت را بہ یک گندم فروخت

وہ حضرت مخدوم الملک کے بڑے محبوب خلیفہ ہوئے، اور ان کو تنِ شرف الدین اور جانِ شرف الدین کہا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ جب دولت آباد پہنچے تو وہاں کے ایک عالم مولانا سید زین الدین کو اپنے علم کا بڑا اعزاز تھا، وہ صوفیہ سے دور بھاگتے، اور ان کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتے لیکن رفتہ رفتہ وہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے قائل ہوتے گئے، ایک روز ان کی قیام گاہ پر پہنچے، اور جب سامنا ہوا تو دوڑ کر اپنی پیشانی ان کے قدموں پر جھکادی، حضرت برہان الدینؒ نے فرمایا، ہاں مولانا! یہ رسم شریعت میں جائز نہیں، مولانا نے کہا کہ جب تک میں اس رسم کو شریعت کے خلاف جانتا تھا، نعمتِ باطنی سے محروم تھا، اسی طرح دہلی کے مولانا نصیر الدین قاسم اپنے علم اور تقویٰ میں بہت مشہور تھے، ان کے استاد مولانا معین الدین عمرانی کو ان پر فخر تھا، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے بچے ان سے درسی کتابیں پڑھا کرتے تھے، لیکن وہ پیری مریدی کے قائل نہ تھے، لیکن آخر میں یکایک خواجہ گیسو دراز سے بیعت کرلی، مولانا معین الدین عمرانی کو اس کی

خبر ہوئی تو مولانا نصیر الدین قاسم کو بلا کر کہا کہ تم تو خود عالم تھے، پھر سید محمد کے مرید کیوں ہوگئے، مولانا نصیر الدین نے عرض کیا پہلے عالم تھا، اب حضرت مخدوم کے سامنے مسلمان ہوا ہوں -

حضرت بو علی قلندر پانی پتی پر سکر اور مستی کی کیفیت برابر طاری رہتی، ایک بار ان کی مونچھیں شرعی حدود سے بہت بڑھ گئی تھیں، کسی کو تراشنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ان کے ہم عصر مولانا ضیاء الدین سنامی اپنے وقت کے بڑے متشرع عالم تھے، ان کو شریعت کی پابندی کرانے کا بڑا جوش رہتا تھا، انھوں نے حضرت بو علی قلندرؒ کی ریش مبارک کو پکڑ کر مونچھوں کو شرعی حد کے مطابق تراش دیا، جب وہ تشریف لے گئے تو حضرت بو علی قلندرؒ اپنی ریش کو پکڑ کر بار بار فرماتے، یہ ریش کیسی مبارک ریش ہے کہ شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی، مولانا ضیاء الدین سنامیؒ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے سماع پر برابر احتساب کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں ان کی شدید مخالفت کی لیکن جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، مولانا ضیاء الدین سنامیؒ نے اپنی دستار حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں کے پاس بچھوا دی، حضرت خواجہ نے اس کو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا، جب وہ مولانا ضیاء الدینؒ کے پاس پہنچے تو مولانا آنکھیں چار نہ کر سکے، حضرت خواجہ اٹھکر باہر چلے آئے، لیکن اسی وقت خبر ملی کہ مولانا کی روح پرواز کر گئی، وہ رونے لگے اور فرمایا ایک حامی شریعت تھا، وہ بھی نہ رہا، آگے چل کر حضرت مجددؒ الف ثانی، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے علمائے سو اور دنیا دار صوفیہ دونوں پر

Marfat.com

تنقید کر کے پاک نہاد علمار اور صوفیہ کو ایک دوسرے سے قریب تر کیا، یہ تمام بزرگ بڑے پایہ کے عالم بھی تھے، اور سلوک کی آتشیں راہیں بھی طے کی تھیں، حضرت مجددؒ نے علمار سو کی جس طرح مذمت کی اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح انھوں نے ان صوفیوں پر لعنت بھیجی جو بدعت کا التزام اور سنت سے اجتناب کرتے اور اپنے ایک مکتوب میں فرمایا کہ اہل ہوا اور بدعتیوں کو خوار رکھنا چاہیے، جس نے کسی بدعتی کی تعظیم کی اس نے گویا اسلام کے گرانے میں اس کی مدد کی، وہ ایسے پیر کو پیر نہیں سمجھتے جو محض خرقہ پہنکر پیر بنجاتے، ان کے نزدیک پیر کہلانے کا وہی مستحق ہو سکتا ہے جو ریاضتوں اور مجاہدوں سے اپنے نفس امارہ کو ختم کر کے سنت سنیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو لازم جانتا ہو، اور اپنے مرید کو حق سبحانہ کی طرف رہنمائی کرتا ہو، وہ اپنے ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ تمام سنتیں حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہیں، اور ان کے اضداد یعنی بدعتیں شیطان کی پسندیدہ ہیں، وہ اپنے ایک مکتوب میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفیہ کا کشف والہام پر اعتبار کرنا ضروری نہیں، اگر وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے تو اس سے پناہ مانگنی چاہیے، اور ایسے کشف والہام کے مقابلہ میں علمائے اہل حق کی تقلید لازمی ہے، صوفیہ کے کشف کو علمائے حق کے قول پر مقدم جاننا سراسر گمراہی ہے، وہ تو علمار کی بدعت حسنہ اور سیئہ کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے، وہ بدعت کو بدعت ہی سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ کسی بدعت میں خواہ بدعت حسنہ ہی کیوں نہ ہو ظلمت اور کدورت کے سوا حسن اور نورانیت کا مشاہدہ ہو ہی نہیں سکتا،

اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی تحریروں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ

Marfat.com

جن صوفیہ نے کتاب وسنت کو ترک کر دیا ہے، وہ ہم میں سے نہیں، اور جو علمار تصوف کا انکار کرتے ہیں، وہ چور اور رہزن ہیں، ان سے بچنا چاہیے،

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں بتایا کہ بعض لوگ یہود اور نصاریٰ کی طرح درویش ہو جاتے ہیں ٹاٹ پہنتے ہیں، زنجیریں گلوں میں ڈالتے ہیں، تو ایسی فقیری اور درویشی ان ہی کی ایجاد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم نہیں دیا، اور اسی طرح بعض لوگ فقیر بنکر گدی پر بیٹھ جاتے ہیں، اپنے مکان سے باہر نہیں ہوتے، اپنی طرف سے طرح طرح کے وظیفے ایجاد کرتے ہیں، نماز معکوس پڑھتے ہیں، اور اسی قسم کی ہزاروں باتوں کو عبادت جانتے ہیں، تو یہ سب بدعت ہیں، اگلی امتیں ان ہی باتوں کی وجہ سے سختی میں پڑ گئیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر سے اپنی مہربانی اٹھالی اور ان کو ان کی سختی اور مشکلوں میں چھوڑ دیا،

اشاعت اسلام | گذشتہ سطروں میں سرسری طور پر ذکر آیا ہے کہ علمار سلاطین سے بدظن اس لیے بھی رہے کہ انھوں نے تبلیغ اسلام کی خاطر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، مگر کچھ غیر مسلم اہل قلم ایسے بھی ہیں جو یہ لکھنے میں تامل نہیں کرتے کہ مسلمان سلاطین نے جبر و تشدد سے ہندوستان میں اسلام پھیلایا، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے سلاطین نے اشاعتِ اسلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، چنانچہ جہاں جہاں ان کے دار السلطنت رہے وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے بجائے کم ہی رہی، انصاف پسند ہندو مورخین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جب فتح وکامرانی کا جوش وخروش ختم ہو جاتا اور ملک میں اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے بڑے پرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش

Marfat.com

اختیار کرنی پڑتی، اسی لیے انھوں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بناکر اسلام کے دائرہ کو وسیع کریں، دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت ساتھ سو برس رہی، بہار اور دکن میں بھی وہ آٹھ سو برس تک حکمراں رہے، لیکن ان علاقوں میں ان کی آبادی ۱۵ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکی،

برطانوی دور حکومت میں انگریز مورخین اور ان کے مقلدوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہوا دینے کے لیے اس پر زیادہ زور دیا ہے کہ فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی عالمگیر، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا اور اس کے ثبوت میں تاریخ اور فرامین سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہادتیں فراہم کی گئیں، اور وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو کم از کم ان کے پایہ تخت کے گرد ہندوؤں کی زیادہ آبادی نہ ہوتی، لیکن ان کے عہد سے ابتک وہاں ہندو اپنے دیرینہ رسوم و رواج کے ساتھ اکثریت میں ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں کے عہد میں کچھ راجپوت اور دوسری ذات کے ہندو مسلمان ضرور ہوئے، ان میں کچھ تو اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہوکر مسلمان ہوئے اور کچھ جاہ و اقتدار اور دنیاوی مفاد کی خاطر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، خود فیروز شاہ تغلق نے فتوحات فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب کے لیے یہ منادی کرادی تھی کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا وہ جزیہ سے بری سمجھا جائیگا، اس اعلان پر کثرت سے غیر مسلم روزانہ ہر طرف سے آتے تھے اور اسلام قبول کرکے انعام و اکرام سے مالامال ہوکر واپس جاتے تھے، مغلوں کے زمانے میں اودھ کے بچگوتی راجپوت، بلند شہر کے لال خانی راجپوت، مرزا پور کے گہروار راجپوت اور اعظم گڈھ کے گوتم راجپوت اپنی

خوشی سے اس لیے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے مذہبی برتری کے علاوہ ان کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالت بھی بلند اور مستحکم ہو جائے گی،

اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں علمار کی خدمات ضرور رہیں، لیکن وہ اس لیے زیادہ نمایاں نہیں ہیں کہ ان کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں محض سرسری طور پر آتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں عرب تاجروں اور صوفیوں نے جو کوششیں کیں اس کی پوری تفصیل ملتی ہے، عرب تاجر جنوبی ہند میں پہنچے تو بڑی خاموشی سے اسلام کا پیام اس علاقہ میں پہنچایا، ملابار، گجرات، کچھ اور جزائر ہند میں اچھوتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ برہمن سے چوہتر قدم دور رہیں، اس سے زیادہ قریب آنے کی جرأت نہ کریں، اور جب راستہ چلیں تو پکارتے جائیں تاکہ لوگ ان سے دور ہٹ جائیں، اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو ان سے چھو جاتا تو جب تک غسل نہ کرتا، کھا نہیں سکتا تھا، اگر کھا لیتا تو برادری سے خارج سمجھا جاتا، اور نیچ ذاتوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا، اور اس کی بقیہ عمر غلامی میں بسر ہوتی یا وہ بھاگ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا، عرب تاجر ایسے لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیتے اور جب وہ مسلمان ہو کر دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لیتے تو دوسرے ہندو بھی ان کی عزت میں کمی نہیں کرتے تھے، یہ دیکھ کر اچھوتوں کے مظلوم فرقوں کی رغبت اسلام کی طرف بہت بڑھ گئی، اس طرح اسلام اپنی اخوت اور مساوات سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا، اور نیچ ذات والوں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہوا رفتہ رفتہ راجاؤں کے قلوب تک پر قابض ہو گیا، ملابار میں جتنے عرب تاجر آتے تھے، وہاں کے باشندوں

کے ساتھ کچھ ایسا برتاؤ رکھتے کہ ہندوؤں کی حکومت میں بھی ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوتی، ہندو راجہ ان کی سرپرستی اس لیے بھی کرتے کہ ان کی تجارت سے ان کے یہاں کا بازار گرم رہتا، اور بہت سی چیزیں آسانی سے میسر آجاتیں، اور وہ ان کی تبلیغ اسلام میں بھی مزاحمت نہ کرتے تھے، چنانچہ ان کے عقائد و عبادات کو دیکھ کر ملا بار کے چیرامن پیرومن کا آخری راجہ بطیب خاطر مشرف بہ اسلام ہوگیا، اس کی راجدھانی ڈنگیلور تھی، اس نے ایک عرب کو اپنے یہاں بلا کر کنانور کا راجہ بنادیا تھا کالی کٹ کا زمورن بھی عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتا تھا، اسی کے زمانہ میں ایک عرب تاجر نے اس کے حدود سلطنت میں ایک بازار قائم کیا، جو بعد میں کالی کٹ کی ایک خوشحال بندرگاہ بن گئی، یہ تاجر یہاں کا قاضی بھی مقرر ہوا، اس کے جانشین زمورن کی حمایت میں ناڈ کے راجہ کے خلاف برابر لڑتے رہے، یہانتک کہ زمورن کا اقتدار جنوبی ملابار میں بھی ختم ہوگیا، زمورن مسلمانوں کا بڑا خیال رکھتا تھا، اور اسلام کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے حدود سلطنت کے ملاحوں کے ہر خاندان سے ایک مرد مسلمان ہو جائے، یہ نومسلم جہازوں میں بھرتی ہوتے تھے، جو زمورن کی جنگی مہموں میں کام آتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کس عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کولتری کا راجہ کا ایک وزیر نایر تھا، جو خود مسلمان ہوگیا اور آگے چل کر کنانور کا راجہ ہوا۔

ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بھی عرب تاجر دسویں صدی میں پہنچ چکے تھے، وہ یہاں بلا تکلف شادی بیاہ کر لیتے، جس سے ان کی آبادی بڑھتی رہی، اور ان کی معاشرت اور عبادت کو دیکھ کر وہاں کے اصلی باشندے متاثر ہوتے اور اسلام

Marfat.com

قبول کرتے رہے،

اشاعت اسلام میں صوفیوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے، مدرا اور ترچناپلی میں حضرت ناتھڑ ولی (المتوفی ۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء) کی وجہ سے اسلام پھیلا، وہ ایک ترکی شہزادے تھے، اور ریاست و امارت چھوڑ کر درویش بن گئے، اور حجاز، ایران اور شمالی ہند کی سیاحت کر کے ترچناپلی پہنچے، اور اپنے زہد، عبادت اور اخلاق سے وہاں کے لوگوں کو ایسا متاثر کیا کہ بہت سے ہندو ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، ان کا مزار ترچناپلی میں ہے، ان کے جانشین سید ابراہیم شہید (المتوفی ۵۶۴ھ/۱۱۶۹ء) تو بارہ برس تک اس علاقے کے حکمراں بھی رہے، ان کا مزار اروادی میں ہے، حضرت ناتھڑ ولی کے ایک دوسرے مرید اور خلیفہ بابا فخر الدین (المتوفی ۵۶۴ھ/۱۱۶۸ء) نے پینوکونڈا کے راجہ کو مسلمان کیا، مدرا میں اشاعت اسلام حضرت علی یار شاہ کے ذریعہ ہوئی جو گیارہویں صدی عیسوی میں بغداد سے بابا ریحان کی ایک جماعت کے ساتھ بھروچ آئے، اور وہاں کے راجہ کے لڑکے کو مسلمان کیا، نورالدین ستاگر نے گجرات کے کمبیوں کوریوں اور کھاروائوں میں اشاعت اسلام کی، اور سب کو مسلمان بنایا، جو اسماعیلی عقائد رکھتے ہیں، سنہ ۱۳۰۳ء میں عرب واعظین میں ایک مبلغ پیر مہابیر کھندایت کے نام سے مشہور ہوئے، بیجاپور آ کر وہاں کے کاشتکاروں کو مسلمان کیا، چودھویں صدی میں حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے پونہ اور بلگام کے ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ کی، کوکن میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی نسل کے ایک بزرگ شیخ بابا عجب نے اسلام پھیلایا، اور وہ دہانوں میں مدفون ہیں، دھوار کے اضلاع میں حضرت ہاشم پیر گجراتی کے ذریعہ اسلام پھیلا، ستارا کے علاقہ میں ایک نومسلم پیر شمبوا پاکوشی نے وہاں کے

Marfat.com

لوگوں کو مسلمان کیا، بارہویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ سید احمد سلطان سخی سرور المعروف بہ لکھی داتا (المتوفی ۵۷۷ھ ۱۱۸۱ء) نے شاہ کوٹ متصل ملتان میں آکر قیام کیا، اور ہندو مسلمان دونوں ان کے معتقد ہوئے، ان کے پیرو سلطانی کہلاتے ہیں، اور پنجاب خصوصاً جالندھر میں بہت ہیں، راجستھان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذریعہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا اور صرف دہلی سے اجمیر کے راستے میں انھوں نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا، پنجاب کا مغربی حصہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکر (المتوفی ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء) کے فیوض سے سیراب ہوا، جواہر فریدی میں ہے کہ بابا گنج شکر نے پنجاب کی گیارہ قوموں کو تعلیم و تلقین سے مشرف بہ اسلام کیا، حضرت بو علی قلندر (المتوفی ۷۲۴ھ) نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا، کشمیر میں شاہ مرزا بلبل شاہ، سید علی ہمدانی (المتوفی ۱۳۸۴ء) اور میر شمس الدین عراقی کی وجہ سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا، بہار میں فردوسیہ کے بزرگ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں لگے رہے، پندرہویں صدی عیسوی میں جب بنگال کے راجہ کنس کے بیٹے جٹ مل نے اسلام قبول کیا تو اس کے اثر سے کثرت سے ہندو مسلمان ہوئے، وہاں عام طور سے متمول مسلمان قحط کے زمانے میں ہندوؤں کے بچوں کو خرید لیتے اور ان کی تعلیم و تربیت اسلامی طریقہ پر کرتے، جب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ اخی سراج الدین (المتوفی ۱۳۵۷ء) اور ان کے خلیفہ شیخ علاء الحق (المتوفی ۱۳۹۸ء) نے بنگال میں قیام کیا، اور توحید رسالت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی مساوات بھی پھیلائی تو اس کے اثر سے وہاں کے نیچی ذات کے ہندو جو خود ہندوؤں میں ذلیل نظروں سے دیکھے جاتے تھے، بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، سلہٹ میں حضرت

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے پیر بھائی شیخ جلال الدین تبریزی (المتوفی ۱۲۲۵ئہ) نے اسلام کی اشاعت کی، ان کا مزار سلہٹ میں ہے،

اشاعت اسلام کا روشن اور تاریک پہلو | اشاعت اسلام سے مسلمانوں کی تعداد ضرور بڑھ گئی، گو جس سرعت سے عراق، شام، مصر اور ایران میں اسلام پھیلا، ہندوستان میں نہ پھیل سکا، پھر بھی مسلمانوں کی تعداد میں روزافزوں ترقی ہوتی گئی، مبلغوں نے غیر مسلموں کو مسلمان تو ضرور بنا دیا، مگر ان کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان میں اسلامی اعمال و اخلاق اور اسلامی کردار پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، خود پشتینی مسلمان بھی بڑی حد تک اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہوتے گئے، نومسلموں سے تو ان کے بہت سے موروثی رسوم و رواج بھی دور نہ ہو سکے، اسی لیے آج بعض اہل قلم کو یہ لکھنے کا موقع مل گیا ہے کہ پنجاب کے بہت سے مسلمان مکتی اور لاچی جیسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، امرتسر کے میراثی درگا بھوانی پر نذریں چڑھاتے ہیں، پنڈی کے مسلمان چیچک کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں، یوپی کے مسلمان بھاٹوں کے یہاں برہمن پروہت بنتے ہیں، کچھ کے بعض میمن ہندوؤں کی طرح جسم پر بھبھوت ملتے ہیں، پنجاب کے بعض مسلمان نقرا دھونی بھی رماتے ہیں، یوپی کے چونی ہار کالکا مائی کی پوجا کرتے ہیں، اور ہندوؤں کی طرح سرادھ کی رسم ادا کرتے ہیں، مشرقی بنگال ترک نواس لکشمی دیوی کے سامنے جھکتے ہیں، اور مغربی بنگال کے مسلمان نقیر لکشمی دیوی کے گیت گاتے ہیں، مدراس دودکلا دسہرہ میں ہتھیاروں کی پرستش کرتے ہیں، اگر ایسے مسلمانوں کو ان کے آبائی مذہب میں واپس لانے کی تھوڑی سی بھی کوشش کی جاتی تو وہ آسانی سے ہندو ہو جاتے،

Marfat.com

اور مسلمان سلاطین جن پر جبر و تشدد سے اسلام پھیلانے کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی ان کو دوبارہ اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرتے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان سلاطین میں وہ مذہبی جوش اور ولولہ نہ تھا جو شروع کے عرب حکمرانوں میں رہا، دوسرے وہ ملک داری اور ملک گیری میں ایسے مشغول رہے کہ ان کو تبلیغ اسلام کی فرصت ہی نہ ملی، یہ ضرور ہے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں انھوں نے شجاعت پامردی اور سپہگری کے جو جوہر دکھائے اپنے نقطۂ نظر سے اسی کو اسلام کی سربلندی تصور کرتے رہے اور اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے کارنامے پر بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے،

تسخیر ملک و تسخیر قلوب ہندوستان میں محمود غزنوی کی متواتر لشکر کشی پر خواہ کتنی ہی تلخ بحث کی جائے، لیکن اگر اس کا مطالعہ ایک فوجی سردار کی حیثیت سے کیا جائے تو کسی شخص کو اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ فوجی قائدوں میں پائے جاتے ہیں، وہ میدان جنگ میں اپنی جان پر کھیل کر اس حصہ میں کود پڑتا جہاں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہوتی مختلف لڑائیوں میں اس کے جسم پر ۲۲ زخم لگے تھے، وہ پورے تہور کے ساتھ لڑتا تو بعض اوقات اس کی گرفت میں تلوار اس طرح چپک جاتی کہ بڑی مشکل سے علٰحدگی جاتی، اس کی جانبازی اور پامردی کو دیکھ کر اس کے لشکری پوری جانبازی اور سرفروشی سے لڑتے، وہ عراق سے لیکر گنگا کی وادی تک تقریباً ۳۳ سال لڑائیاں لڑتا رہا، کبھی ترکستان کی ساری جنگی قوتیں اس کے خلاف معرکہ آرا ہو جاتیں، کبھی ہندوستان کے تمام بہادر راجپوت سردار اسکے خلاف صف آرا ہو جاتے، لیکن وہ کسی موقع پر بھی سراسیمہ نہیں ہوا، ہر لڑائی میں فتح کا سہرا اسی کے سر رہا، اس کا طریقۂ جنگ گو پرانا ہی تھا، لیکن اپنی جانبازی سے

(علما

Marfat.com

اپنی فوج میں نئی زندگی اور نئی سرگرمیاں پیدا کرتا رہا، اس کے لشکر میں عرب خلجی، افغان، ترکمان، دیلمی اور ہندو بھی تھے، اور ان سب مختلف عناصر کو ملا کر اس نے ایک ناقابلِ شکست فوجی دستہ بنائے رکھا، وہ تھکنا جانتا ہی نہ تھا، غور کی دشوار گذار پہاڑیاں، کشمیر کی برفستانی وادیاں اور راجپوتانہ کے ہلاکت خیز ریگستانی علاقے اس کی ہمت کو پست نہ کر سکے وہ غنیم کے سر پر اس طرح دفعتہً پہنچ جاتا کہ اس کو خبر تک نہ ہونے پاتی، اس لیے وہ ان غیر معمولی اوصاف کی بنا پر ان فوجی رہنماؤں کی صف میں جگہ پانے کے لائق ہے، جنھوں نے قوموں کی تاریخ بدل دی ہے،

شہاب الدین غوری کے فوجی کارنامے محمود غزنوی کے سامنے ماند ضرور پڑ جاتے ہیں، لیکن اس کو محمود غزنوی پر اس حیثیت سے فوقیت حاصل ہے کہ محمود ہندوستان میں لڑائیاں جیت کر واپس چلا جاتا، لیکن شہاب الدین غوری اس سرزمین میں ایک سلطنت قائم کرنے کے لیے لڑتا رہا، محمود غزنوی کبھی کوئی جنگ نہیں ہارا، اور شہاب الدین غوری کو ہندو راجاؤں نے دو لڑائیوں میں شکست دی، لیکن کسی کو اس کے اعلیٰ درجہ کے فوجی قائد ہونے میں شک نہیں ہوا، وہ میدان جنگ میں اترتا تو پہلے صحیح صورت حال کا جائزہ لیتا، پھر اسی حساب سے اپنی فوج کو صف آرا کرتا، اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کے صبا رفتار سوار پہلے آگے بڑھتے، پھر پیچھے ہٹ جاتے، پھر اچانک پلٹ کر غنیم کے بازوؤں کی صفیں الٹ دیتے، وہ کسی حال میں بھی شکست کو تسلیم نہیں کرتا تھا، جب پرتھوی راج سے پہلی بار ہارا تو اس نے قسم کھالی کہ بیوی کی خوابگاہ میں اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک اس شکست کو فتح و کامرانی میں نہ بدل دے گا، قطب الدین ایبک نے بعض اپنے سپاہیانہ اوصاف کی بنا پر

گمنامی اور غربت سے نکل کر شہرت، و ناموری حاصل کی، اور اس کی سپہگری سے متاثر ہو کر شہاب الدین غوری نے اس کو اپنا فرزند بنا لیا، شمس الدین التمش جب کسی لڑائی میں شریک ہوتا تو میدان جنگ میں اس سے زیادہ دلیر اور بہادر کوئی اور فوجی نہ ہوتا، شہاب الدین غوری نے جب گکھڑوں پر فوجکشی کی تو جہلم کو عبور کرنے میں سب سے پہلے التمش نے برگستوان پہنا اور اپنا گھوڑا مردانہ وار دریا میں ڈال دیا اور اس کو عبور کر کے دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اس کی جانبازی دیکھ کر دوسرے لشکری بھی دریا میں کود پڑے، اس کے اسی سپاہیانہ اور مدبرانہ اوصاف کے سبب سے قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد ایک نوزائیدہ سلطنت ختم ہونے سے بچ گئی، منگولوں کے طوفان کو دنیا کا کوئی ملک روک نہ سکا لیکن غیاث الدین بلبن نے اپنے آہنی عزم سے ان کی غارت گری سے ہندوستان کو بچا لیا، غلام سلاطین کے فوجی سرداروں میں بختیار خلجی نے مٹھی بھر فوج سے بہار اور بنگال کو فتح کیا، بلبن کا چچا زاد بھائی شیر خاں اپنے اوصاف میں واقعی شیر تھا، وہ جب تک زندہ رہا، تاتاری، سنام، لاہور اور دیال پور کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکے، ملک تمر الدین قیران تمر اور ملک عز الدین طغرل طغان نے اودھ اور لکھنوتی کو دہلی سے منسلک کیا،

خلجی سلاطین میں جلال الدین خلجی کہا کرتا کہ اگر میں اپنی تلوار کھینچ لوں تو بیس بائیس افراد کو تنہا دوڑا لوں، اور اگر سر میدان کھڑا ہو جاؤں تو اگر ایک بڑی جماعت مجھ پر چوالیس بار بھی حملہ کرے تو میرا بال بیکا نہیں کر سکتی، علاء الدین خلجی صحیح معنوں میں تمام فوجی سرداروں کا سردار تھا، وہ دشمنوں کو مغالطے میں ڈال کر اور تھکا کر پسپا کر دیتا تھا، اس کے سرداروں میں ظفر خاں میدان جنگ میں اپنے حریفوں سے کشتی لڑ کر اپنی بہادری کا جوہر دکھاتا تھا، الغ خان اور نصرت خاں نے ملتان گجرات، رن تنبھور

Marfat.com

اور جیسلمیر وغیرہ کو فتح کر کے خلجی حکومت کا دبدبہ قائم کیا، ملک کافور ہزار دیناری کے سر دکنی فتوحات کا سہرا رہا،

غیاث الدین تغلق نے منگولوں سے ۲۹ بار جنگ کی اور ہر بار ان کو شکست دی، سلطان محمد تغلق کے نصف دور حکومت تک اس کی فوج جہاں بھی گئی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتی آئی، سکندر لودی اپنی فوج پر اس قدر حاوی تھا کہ وہ جب کہیں کوئی لشکر بھیجتا تو صبح و شام دو فرامین بھیجا کرتا تھا جس میں روزانہ کی ضروری ہدایتیں ہوتی تھیں اور کسی کو اس کی عدول حکمی کی جرات نہ ہوتی تھی،

ایک فوجی قائد میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ سب بابر میں موجود تھیں اس نے جتنی لڑائیوں میں فتح حاصل کی، اتنے ہی میں شکست بھی کھائی، لیکن شکست سے اس کی اندرونی صلاحیتیں اور بھی ابھر آئیں وہ اپنے لشکریوں اور ساتھیوں کو محض اپنی باتوں اور تقریروں سے تازہ دم بنا دیتا تھا اکبر کا شمار دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں ہوتا ہے، اس کی تیز گامی، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور نشانہ بازی، دشمنوں پر بجلی کی سرعت کے ساتھ یورش، حیرت انگیز حد تک تھی،

اس نے اپنی فوج کا جو نظم و نسق قائم کیا تھا، وہ اس دور کے لحاظ سے بہترین سمجھا جاتا تھا، اسی لئے اس کو کسی جنگ میں شکست نہیں ہوئی، جہانگیر گو بڑے ناز و نعم میں پلا تھا، لیکن ضرورت کے وقت ایک جری سپاہی بھی بنجاتا تھا، وہ نورجہاں سے کئی دن تک محض اس لیے خفا رہا اور نہیں بولا کہ ایک بار اس کے ایک خیمہ میں ایک شیر آگیا تو وہ بھاگ کر دوسرے خیمہ میں چلی گئی تھی، شاہ جہان کو اپنے جنگی تجربات پر اتنا بھروسہ تھا کہ جب اس نے بلخ اور قندھار کی تسخیر کے لیے اپنے شہزادوں کو بھیجا تو دارالسلطنت میں بیٹھ کر ان کو ہدایتیں بھیجتا تھا، عالمگیر کی فوجی قیادت کے مقابلہ میں بڑے بڑے

Marfat.com

ازمود کار فوجی سردار بے بس ہو کر رہ جاتے اور بلخ کے حکمرانوں کو کہنا پڑا کہ ایسے آدمی سے لڑنا اپنی قسمت سے جنگ کرنا ہے، اسی کے زمانہ میں مغلوں کی سلطنت کے حدود انتہائی درجہ تک پہنچ گئے۔

مغل بادشاہوں کے فوجی سرداروں کے کارنامے بھی فخر کے ساتھ لکھے جانے کے لائق ہیں اکبری عہد میں بیرم خان، خان خاناں، شہاب الدین بہادر خان آتکہ خاں، منعم خاں، مظفر خاں، خان اعظم، مرزا کوکہ خان، لشکر خاں، شہباز خاں، ادہم خاں کوکہ ۔ ۔ ۔ ۔

آصف خاں، فتح اللہ شیرازی، مرزا قوام الدین جعفر ملک، اور جہانگیری عہد میں امیر الامراء شریف خاں، شیخ فرید، خانخانان عبدالرحیم خاں، آصف خاں قزوینی، آصف خاں ابوالحسن، صادق خاں، ارادت خاں، اسلام خاں چشتی، اعتمادالدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، احمد خاں نیازی، اللہ وردی، شاہجہانی دور میں علامہ شکر اللہ افضل خاں آصف خاں ابوالحسن، ارادت خاں، صادق خاں، اسلام خاں، میر جملہ معتمد خاں، صلابت خاں احسن اللہ خاں جعفر خاں، اور خلیل اللہ خاں عالمگیری عہد میں میر جملہ، محمد امین خاں، افضل خاں، شایستہ خاں، دلیر خاں، ہمت خاں، ذوالفقار خاں، قاسم خاں وغیرہ نے جو فتوحات حاصل کیے وہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ کے لیے شاندار اور زریں کارنامے کیے جا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان فاتحوں کو بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بیشمار جانیں تلف ہوئیں، خونریزی کے ساتھ غارت گری بھی ہوئی جیسا کہ جنگ کے موقع پر آج بھی متمدن ممالک میں ہوتی ہے، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خونریزی اور غارت گری اسلام کی طرف منسوب کر دی گئی اور ان فاتحوں کی تلوار اسلام کی تلوار سمجھی گئی اس میں شک نہیں کہ جنگ کے وقت جہاں اور تدبیریں کی جاتی تھیں، وہاں لشکریوں کی مذہبی

Marfat.com

غیرت اور حمیت بھی ابھاری جاتی، جس سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا تھا، اس لیے فاتحین عام لڑائیوں کو بھی جہاد کا رنگ دیدیتے تھے، لیکن ان لڑائیوں کو جہاد کا رنگ دینے میں اسلامی تعلیمات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے تھا، جس میں اس کی تصریح ہے کہ جنگ کے موقع پر ایسے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہو، عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کیے جائیں، پھل دار درخت نہ کاٹے جائیں، کوئی آباد جگہ ویران نہ کی جائے، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار نہ ذبح کیے جائیں، نخلستان نہ جلائے جائیں، مال غنیمت میں غبن نہ کیا جائے، لوٹ کا مال مردار کا گوشت سمجھا جائے، خانقاہیں، اور عبادت گاہیں منہدم نہ کیجائیں، اور نہ کوئی ایسا قصر گرایا جائے جس میں ضرورت کے وقت دشمن قلعہ بند ہوتے ہوں، ناقوس پھونکنے اور گھنٹے بجانے کی ممانعت کسی حال میں نہ ہو،

اگر یہ تمام باتیں ملحوظ رکھی جاتیں تو واقعی مسلمان فاتحین کی لڑائیوں سے اسلام کو سربلندی، حاصل ہوتی، لیکن اس کے بجائے مسلمان فاتحین اپنی نسلی اور قبائلی خصوصیت کی بنیاد پر وہ تمام باتیں کرتے رہے، جو عام طور سے جنگ کے موقع پر ہوتی ہیں، گو ملک گیری کے بعد ملک داری کے سلسلہ میں انھوں نے مفتوحہ علاقہ میں امن پروری اور عدل پسندی کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے،

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انکی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی، اور معاشرتی زندگی میں بہت سے جلوے پیدا ہوئے، درباری اور معاشرتی زندگی میں نئے نئے آداب رائج ہوئے، جن کو خود یہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی اختیار کیا، زینت و آرائش میں

انتہائی حسن وجمال نظر آنے لگا، علوم وفنون کی سرپرستی میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا لباس بڑا تنوع پیدا ہوا کپڑے کی مصنوعات کو انتہائی ترقی ہوئی، زربفت، مخمل، طاس، مشجر، دیبا، ململ، پشمینے شال، قالین وغیرہ کی طرح طرح قسمیں بنائی گئیں مختلف قسم کی زیورات کی صناعی بڑی لطافت پیدا کی گئی جواہرات کا انبار لگا دیا گیا سنگ کاری کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے، خوشبویات میں مشک، عنبر، لادن، کافور، زباد، مید، عود، صندل، سلارس، لوبان، اظفار الطیب، سنتوک، ارگجہ، عبیر مایہ، زعفران وغیرہ سے طرح طرح کی چیزیں تیار کی گئیں، پھولوں کی چمن آرائی، خیابان بندی اور طرح ادائی کو ایک مستقل فن بنا دیا گیا، لاہور، دہلی، کشمیر اور آگرہ کے باغات آج بھی ان کے ذوق کی لطافت کی گواہی دے رہے ہیں، پھلوں میں پیوند کاری کرکے بہت سے نئے پھل ہندستان میں رائج کیے گئے، کھانے کی چیزوں میں چاول، آٹے اور گوشت کی جتنی متنوع چیزیں بنائی گئیں، پھر طرح طرح کے جو حلوے اور مربے تیار ہوئے، ان سے ہندوستانی کھانوں میں بڑی رنگا رنگی پیدا ہوئی، فن تعمیرات میں شلغم نما گنبدوں، کئی کئی پہل کے برجوں، پھر نقاشی، مینا کاری، استرکاری، کاشی کاری، سنگ مرمر پر پچے کاری وغیرہ میں جو جدت پیدا کی گئی اس کو کسی حال میں بھلایا نہیں جا سکتا، تاج محل آج بھی اس زمانے کے فن تعمیرات کی لطافت، نفاست اور نزاکت کی شہادت دے رہا ہے، موسیقی میں امیر خسرو، حسین شاہ شرقی، نائک بخشو، تان سین، باز بہادر، سبحان خاں، محب خاں، بایزید خان، سلطان زین العابدین، سلطان مظفر گجراتی، سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان واجد علی شاہ کی ایجادات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں فن مصوری میں جو نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری اور فطرت نگاری پیدا ہوئی، اس سے ایک خاص اسٹائل بنا، جو مغل

Marfat.com

مصوری کے نام سے ابتک باقی ہے، اور یہ اسٹائل نہ بنا ہوتا تو ہندوستان کی مصوری کے مختلف اسکول وجود میں نہ آتے، کاغذ مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے، رنگپور، اچھ، جونپور، احمد آباد، احمد نگر، نعمت آباد، برہانپور، زین آباد، مبارک آباد، مصطفیٰ آباد، دولت آباد، فیروز آباد، لاہور، الہ آباد، آگرہ، فتحپور سیکری، حیدرآباد، مراد آباد، اورنگ آباد، ابراہیم آباد، عظیم آباد، بھکر، سامانہ، اور خدا جانے کتنے اور قصبات اور قریے مسلمانوں کے زمانے میں آباد ہوئے، پھر جو پل، نہریں اور سڑکیں تعمیر کی گئیں اُن کی ان گنت تعداد شمار میں نہیں آسکتی، پھر پورے ہندوستان کی پیمایش کرائی گئی، قابل زراعت اور ناقابل زراعت زمینوں کی تفریق کی گئی، تقاوی دینے کا قاعدہ جاری کیا گیا، تشخیص و جمع کے متعدد طریقے مقرر ہوئے، زمین کی قسمیں کی گئیں مثلاً بٹائی، بارانی، چاہی، نہری وغیرہ، حیوانات کی نسل کی ترقی میں پوری کوشش کی گئی، ان تمام تفصیلات کے لیے علحدہ کتابیں بھی مطالعہ کی جاسکتی ہیں، اور خود جدوناتھ سرکار نے ہندوستان پر مسلمانوں کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ (۱) مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازرانی اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں چیزیں ختم ہوگئی تھیں، (۲) ہندوستان کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیا کے شمال میں اندرونی طور پر امن و سکون قائم ہوا، (۳) ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات و اطوار و لباس وغیرہ اور معاشرتی امور میں یکرنگی پیدا ہوئی، (۵) ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا،

جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس سے تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں، (۶) ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی، جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیوں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا، (۷) دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی، (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، جدو ناتھ سرکار یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد ہوا، محلوں اور مقبروں کی تعمیر ان کی خاص چیز ہے۔ پھر ان کی وجہ سے مصوری کا ایک خاص اسکول قائم ہوا، اور ان ہی کی وجہ سے ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

لیکن یہ دیکھکر دکھ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان تمام کارناموں کو نظر انداز کر کے مسلمان بادشاہوں نے جنگ کے زمانے میں جو کچھ کیا اسی کو زیادہ اچھالنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس سلسلہ کی خونریزی اور غارت گری کو اسلام کی طرف منسوب کر کے اسلام خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کر رہا ہے،

تسخیر قلوب مسلمانوں نے جن کے خلاف جنگ کی انھوں نے غصہ اور عداوت میں اگر مسلمانوں کے مذہب کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی تو یہ علماء کا فرض تھا کہ

Marfat.com

جنگ کے بعد اسلام کی سچی تعلیم کے مطابق اس کو دین رحمت کی حیثیت سے پیش کرتے، اور یہ بتلاتے کہ ان کی کوئی تعلیم بھی انسانوں کے لیے رحمت سے خالی نہیں، اور دنیا کی کوئی مخلوق بھی اس کے فیضان رحمت سے محروم نہیں، اس کا خدا رحمٰن و رحیم ہے، ستّار و غفّار ہے، اس کی تمام صفات میں رحمت، ستاری اور غفّاری کا غلبہ ہے، اس کی رحمت و مغفرت کا دروازہ گنہ گاروں کے لیے بھی بند نہیں، اور بڑے سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت بے پایاں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اسلام میں انسان کا رتبہ بہت بلند ہے، وہ اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، زمین و آسمان، چاند اور سورج، دریا اور سمندر، خشکی اور تری سب اس کے لیے پیدا کی گئی ہے، اسلام رنگ و نسل و نسب اور سارے امتیازات کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے، اور وہ سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کرنا چاہتا ہے، وہ انسانی مساوات، اخوت، غربا د مساکین کی پرورش، خدمت خلق، انسان دوستی، عدل پروری، رحم و کرم، لطف و مدارات، نیک کاموں کی تبلیغ و ترغیب اور برائیوں کے انسداد کے لیے ہے، وہ اس حدیث قدسی کی عملی تعبیر و تشریح ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے ابن آدم میں بیمار ہوا تونے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا پروردگار! میں تیری عیادت کس طرح کرتا، تو تو خود سارے جہان کا پروردگار ہے، خدا فرمائے گا، کیا تجھکو نہیں معلوم میرا فلاں بندہ بیمار پڑا، مگر تونے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو عیادت کرتا تو مجھکو اس کے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم! میں نے تجھسے کھانا مانگا تو نے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار تو تو خود رب العالمین ہے، میں تجھکو

کھانا کس طرح کھلاتا، خدا فرمائے گا، میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا، مگر تو نے نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار، میں تجھ کو کس طرح پانی پلاتا، تو تو خود رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا، فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے نہیں پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس موجود پاتا،

اسی طرح علمار اس کا ثبوت دیتے کہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت نہ کی جائے، اور ان کو انسانی حقوق سے محروم نہ کیا جائے، اور ان کے معاشرتی حقوق ادا کیے جائیں، کیونکہ کلام مجید میں دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت ہے، اور یہ حکم ہے کہ مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے لوگوں (معبودوں) کو پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بھی ناحق اور نادانی سے خدا کو برا کہیں، پھر کلام مجید میں یہ بھی ہے کہ دین میں جبر و زبردستی نہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے مظالم سے تنگ آجاتے، اور آپ سے درخواست کی جاتی کہ آپ ان کے لیے بد دعا فرمائیں تو آپؐ فرماتے کہ میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں،

پاک طینت علمار نے اسلام کو اس رنگ میں ضرور پیش کیا ہوگا، کیونکہ اگر اسلام اس رنگ میں یہاں کے باشندوں کو نظر نہ آتا تو یہاں وہ سرسبز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ایسے علمار کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں نہیں کیا گیا ہے، اور ستم یہ ہے کہ بعض مورخوں نے بعض متشدد علمار کے ایسے اقوال نقل کر دیے ہیں، جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً ضیار الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی نے

قاضی مغیث الدین سے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ

"ہندوؤں کو ذلیل رکھنا دینداری کے لوازم میں سے ہے کیونکہ یہ حضرت مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اسی لیے حضرت مصطفےٰ علیہ السلام نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مال غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے۔" (ص ۲۹۰)

یہ تمام تر قاضی مغیث الدین کی من گھڑت حدیث ہے، جس کو مولانا ضیاء الدین برنی نے خواہ مخواہ نقل کر کے نہ صرف اس عہد کی تاریخ بلکہ اسلام کو نقصان پہنچایا! حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کے رویے کی جو وضاحت کر دی ہے وہ اس حدیث کی روایت سے ظاہر ہوتی ہے قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں کی ہے، اس میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو ان کو بلا کر فرمایا

الا من ظلم معاهدا او کلفه	جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی)
فوق طاقته او انتقصه واخذ	پر ظلم کرے گا یا اس سے اس کی طاقت سے
منه شيئا بغير طيب نفسه فانا	زیادہ کام لے گا یا اس کو ذلیل کرے گا
حجيجه يوم القيامة	یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا

صحابہ کرام کا بھی عمل اسی پر رہا، شام کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا، اس میں یہ الفاظ تھے، کہ مسلمانوں کو ان کے ظلم و نقصان سے روکو

Marfat.com

اور ان کے مال کھانے سے منع کرو۔ اور ان کو جو حقوق تم نے جن شرائط پر دیے ہیں، ان کو پورا کرو'
حضرت عمرؓ کو ایک غیر مسلم ہی نے شہید کیا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی وفات کے
وقت نہایت ضروری وصیتیں جو کیں ان میں ایک یہ تھی کہ ذمیوں یعنی غیر مسلموں کے
ساتھ جو اقرار ہیں وہ پورے کیے جائیں۔ ان کی طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے
اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی طرف سے لڑائی کی جائے، حضرت عمرؓ کی
اس وصیت کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، حضرت عمرؓ کے پاس ایک
عیسائی غلام استنق نامی تھا، جس کو انھوں نے دعوت اسلام دی، اس نے انکار کیا
تو فرمایا لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، اور دوسرے صحابہ بھی
ذمیوں یعنی غیر مسلموں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تو فوراً مواخذہ کرتے تھے، سعید بن زیدؓ
نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں کو مال گذاری وصول کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا کیا گیا
ہے، اسی وقت وہاں کے حاکم سے جا کر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
سنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے، خدا اس کو عذاب دے گا، ہشام بن حکیم کو بھی
اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور انھوں نے اسی وقت حاکم یعنی عیاض بن غنم کے پاس جا کر
ملامت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا، ان تاریخی حقائق
کے باوجود مولانا ضیاء الدین برنی کو قاضی مغیث الدین کے اس بیان کو نقل کرتے میں
تامل نہیں ہوا کہ محصل دیوان جب ہندو خراج گذار کے منہ میں تھوکے تو وہ بغیر کسی
کراہت کے اپنا منہ کھول دے اور اس حالت میں بھی محصل کی پوری خدمت کرے'
مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک
مشہور مصری محدث اور عالم مولانا شمس الدین ترک ہندوستان تشریف لائے'

تو علاء الدین خلجی کا طرز عمل یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جو خواری، زاری، لا اعتباری اور بے مقداری کا تھا، اس پر آفرین بھیجی، لیکن موجودہ دور کا کوئی تنگ نظر اور متعصب عالم بھی اس مصری عالم کے آفرین بھیجنے پر خوش نہیں ہو سکتا، معلوم نہیں اس زمانے میں کس پس منظر میں ایسی فضول باتیں کہی گئیں، جن کو اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اس سے کوئی فائدہ تو حاصل نہیں ہوا، لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ اس قسم کے اقوال سے شرارت پسندوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک حربہ مل گیا،

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دور میں مولانا ضیاء الدین برنی کے معاصر اور دوست امیر خسرو اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعہ سے ہندوؤں کی تسخیر قلوب کے لیے ہر قسم کی کوشش کر رہے تھے، اور ان کی شاید یہ تمنا تھی کہ یہاں کے مختلف باشندوں میں یگانگت اور ہم آہنگی ہو، اور وہ ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھ کر باہمی احترام کا جذبہ پیدا کریں، چنانچہ وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خان میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر قصداً لے آتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے، اور اس کے لیے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے، اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے، خسرو نے اس جذبہ کی قدر کی ہے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے علوم و فنون کی مدح سرائی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دانش و معانی ہندوستان میں اندازہ سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے، لیکن ہندوستان اس میں تہی مایہ نہیں، یہاں منطق بھی ہے، اور نجوم اور کلام بھی، البتہ ہندو فقہ سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ طبعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں،

مابعد الطبیعیاتی علوم نہیں جانتے ہیں، لیکن مسلمان اور دوسری قومیں بھی ان سے ناواقف ہیں، خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہمارے عقائد سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی توحید، اس کے وجود اور قدم کے معترف ہیں، اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل مختار اور عالم جزو کل ہونے کے قائل ہیں، اس سلسلہ میں امیر خسرو نے ہندوؤں کے مذہب کا بھی اسلام کے علاوہ اور تمام مذہبوں سے مقابلہ کیا ہے، اور اس کو ان سے بہتر بتایا ہے، اور اس کے وجوہ یہ بیان کیے ہیں کہ ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے، لیکن ہندو ایک مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقہ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست سات خدا کو مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقہ مشبہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتے ہیں، ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس خیال سے بری ہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور اس کی اطاعت کے منکر نہیں، وہ اور چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں،

امیر خسرو ہندو مرد اور عورت کے جذبات وفا شعاری سے بھی متاثر ہوئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت

اڈ مالک کے لیے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اور وہ تو یہ بھی کہہ گئے ہیں،

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری　　　　ہم از وے آموز پرستش گری

اور پھر تسخیر قلوب کے لیے امیر خسرو نے ہندوستان کی ہر چیز کی تعریف کی ہے، اپنے ہم مذہبوں کو اس سے محبت اور لگاؤ پیدا کرنے کی تلقین کی، ہندوستانی زبان، ہندوستانی کپڑوں، ہندوستانی پھولوں میوں، پرندوں، جانوروں اور عورتوں کے حسن کے بیان کرنے میں ان کا قلم رقص کرنے لگتا ہے، اسی تسخیر قلوب کے لیے انھوں نے ہندی میں اشعار کہہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ چھائے رہیں گے پنڈت جواہر لال نہرو اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں تحریر فرماتے ہیں کہ امیر خسرو نے بہت سے موضوع پر لکھا ہے، خاص طور سے ہندوستان کی ان چیزوں کی مدح کی ہے جن میں ہندوستان کو فوقیت حاصل ہے، یہاں کے مذہب، فلسفہ، منطق، زبان، سنسکرت، گرامر، موسیقی، ریاضی، سائنس اور آم کی تعریف کی ہے، لیکن ان کی زیادہ شہرت ان کے مشہور گیتوں کی وجہ سے ہے جو انھوں نے عام فہم ہندی زبان میں لکھے ہیں" پندت جی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھکو کسی جگہ کی ایسی مثال نہیں ملی کہ چھ سو برس پہلے جو گیت لکھے گئے وہ عوام میں برابر مقبول رہے، اور الفاظ کی تبدیلی کے بغیر ویسے ہی گائے جاتے ہیں،

امیر خسرو کی تقلید میں بہت سے مسلمان شعراء نے ہندی اور سنسکرت میں اشعار کہے ان کے ناموں کی فہرست طویل ہے، کچھ کے نام یہ ہیں، داؤد، قطبن، ملک محمد جائسی، شیخ نبی، قاسم شاہ، نور محمد، تاج، جمال، عبدالرحیم خانخاناں، قادر، مبارک، عالم، شیخ شاہ محمد، نظام الدین، مدھنایک، سید رحمت اللہ، میر عبدالجلیل بلگرامی، غلام نبی،

Marfat.com

سید برکت اللہ، محمد عارف، شاہ کاظم وغیرہ،

خود صوفیہ کرام نے ہندی دوہے کہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت شیخ عبدالحق ردولوی، اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دوہے مشہور ہیں، قوالی میں بھجن کا رنگ غالباً ہندوؤں ہی کی تسخیر قلوب کے لیے پیدا کیا گیا، صوفیہ کرام نے اپنی لینت، محبت، شفقت، نرمی، خوش خلقی، وسیع المشربی، وسیع الخیالی اور انسان دوستی سے غیر مسلموں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش برابر کی، حضرت شیخ نظام الدین اولیار ہندو جوگیوں سے بلا تکلف ملتے اور ان کی باتیں غور سے سنتے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار اجودھن میں حضرت فریدالدین گنج شکر کے پاس ایک جوگی آیا تو حضرت شیخ نظام الدین اولیار نے اس سے پوچھا کہ تم کونسی روش پسند کرتے ہو اور کس چیز پر عمل کرتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے علوم یہ بتاتے ہیں کہ انسانی نفس میں دو عالم ہیں، ایک عالم علوی اور ایک عالم سفلی، سر سے ناف تک تو عالم علوی ہے، اور ناف سے پاؤں تک عالم سفلی ہے، عالم علوی میں سچائی، صفائی، بلند اخلاقی اور حسن معاملہ ہوتا ہے، اور عالم سفلی میں نگہداشت، پاکی اور پارسائی ہوتی ہے حضرت شیخ نظام الدین اولیار نے جب یہ باتیں سنیں تو فرمایا،

مرا این سخن او خوش آمد

اسی طرح ایک اور جوگی حضرت فریدالدین گنج شکر کی خانقاہ آیا تو اس نے بچوں کی پیدائش کے متعلق گفتگو کی، جس کو حضرت شیخ نظام الدین اولیار نے بڑے شوق سے سنا اور کہا کہ میں نے تمھاری گفتگو کو سنکر ذہن نشین کر لیا ہے، اور تم بھی میری گفتگو کو غور سے سنو۔

غیر مسلموں کے ساتھ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا جو رویہ رہا، اس کی ترجمانی شاہ محمد سلیمان تونسوی (المتوفی ۱۸۴۹ء) کے ان ملفوظات سے ظاہر ہے جو نافع السالکین میں درج ہے، انھوں نے فرمایا کہ ہمارے سلسلہ کے طریقہ میں ہے کہ ہندو اور مسلمان سے صلح رکھی جائے اور اس بیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

با مسلماں اللہ اللہ اور با برہمن رام رام سے مراد یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو تو دوسرے ہاتھ میں سندان عشق، اور تمام اکابر صوفیہ کا عمل اسی پر رہا اور اسی کے ذریعہ ہندو مسلم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے تھے، البتہ کچھ صوفیہ ایسے بھی گذرے ہیں، جنھوں نے تسخیر قلوب کی خاطر جام شریعت تو چھوڑ دیا اور صرف سندان عشق لیکر آگے بڑھے، کشمیر میں کچھ ایسے صوفی پیدا ہو گئے تھے جو اپنے کو رشی کہتے، انھوں نے ہندو رشیوں ہی کی طرح یوگ، حبس دم اور دھیان، گیان کے طریقوں کو اپنایا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں کچھ ایسے صوفی بھی تھے، جو تصوف اور ویدانت کو ایک ہی چیز سمجھتے رہے، پھر کبیر، اکبر، اور دارا شکوہ صرف سندان عشق ہی کے معترف تھے، کبیر نے جب یہ تعلیم دی کہ دنیا کا مالک ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے سامنے دیوی دیوتاؤں کی کوئی حقیقت نہیں، وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض سچے پریم کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں،

کہے کبیر اک رام جپو رے، ہندو ترک نہ کوئی

Marfat.com

تو اس میں بڑی ہمہ گیریت تھی، لیکن اس پیام میں سندان عشق کے ساتھ جام شریعت نہیں تھا، اسی لیے علماء کے زیر اثر رہنے والے مسلمان عوام ان کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں ہوئے، یہی حال دین الٰہی کا بھی ہوا،

اکبر کے دین الٰہی میں بظاہر بڑی وسیع المشربی ہے، اور اس کو ایک گروہ انسانیت کا بہت بڑا منشور سمجھتا ہے، اکبر نے اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے غیر مسلموں کے دلوں کو تسخیر کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن جب اس نے اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی تو پہلے اس کو امام عادل، مجتہد، صاحب دین حق اور ہندوستان کی بہتر فرقوں کے اختلاف مٹانے والا نبی امی بننا پڑا، اور پھر دین الٰہی کی تاسیس و ترویج کے سلسلہ میں اس نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی اس مذہبی بدعت سے نہ صرف اس زمانہ کے مسلمان برگشتہ خاطر ہوئے، بلکہ خود شہزادہ سلیم میں آزردگی پیدا ہوئی مآثر الامراء جلد دوم ص ۱۱ میں ہے،

"جنت مکانی (یعنی جہانگیر) می نویسند کہ چوں شیخ ابوالفضل بہ پدر من ذہن نشین کردہ بود کہ جناب ختمی پناہی (صلی اللہ علیہ وسلم) فصاحت تمام داشت، قرآن کلام اوست، ہنگام مراجعت از دکن بدست آمدنش از دکن نرسنگھ دیو گفتم کہ بقتل آورد بعد ازیں پدرم ازیں اعتقاد برگشت"

اس دور کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا حضرت احمد سرہندی کو بھی دکھ تھا کہ اکبر نے کلمہ کی جگہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھوانا شروع کیا تھا، حج، زکوٰۃ، نماز باجماعت کو بدعقلی کی باتیں قرار دیدی گئی تھیں، مسلمانوں کے لیے گاؤ کشی کی ممانعت ہوگئی تھی، لیکن سور اور کتے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا تھا،

Marfat.com

مسلمانوں کے لیے قاضیوں کا مقرر کرنا بند ہو گیا تھا، حتی کہ مسجدیں ویران ہو گئی تھیں، بلکہ بہت سی منہدم کر دی گئی تھیں وغیرہ وغیرہ، ان تمام باتوں سے حضرت احمد سرہندیؒ کو انتہائی تکلیف تھی، وہ بڑے دکھ اور درد سے جہانگیر کے دربار کے ممتاز امیر، شیخ فرید کو لکھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں اہل اسلام کے سر پر کیا گذرا ہے۔۔۔ مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز تھے، اور اگر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے، (مکتوب نمبر ۴۷ جلد اوّل)

اسی سلسلہ میں بعض اوقات انھوں نے ہندوؤں اور شیعوں کے متعلق کچھ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انتہائی آزردگی اور اشتعال کا نتیجہ ہے، وہ ایک دکھے ہوئے دل کی چیخ اور پکار ہے، اکبر کی بدعتوں سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھے، ان کے لیے تو بدعت حسنہ بھی کوئی چیز نہیں تھی، اور اکبر کی تمام بدعتیں تو ان کے نزدیک تو بدعات سیئہ تھیں، وہ اسلامی عقائد میں کسی قسم کی بیرونی آمیزش پسند نہ کرتے تھے، دوسرے مذاہب سے اسلام کا موازنہ اور مقابلہ کر کے خوامخواہ کا اشتراک پیدا کرنا بھی ان کو گوارا نہ تھا، ایسی کوششوں سے ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی تھی، اسی لیے انھوں نے اسلام کو تمام بدعتوں سے پاک کرنے میں بڑی صعوبتیں اٹھائیں، اور جو ہندوانہ رسم و رواج مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے ان کو بدعت سیئہ سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی تو مذمت کی ہے کہ مسلمانوں نے ان کو قبول کر لیا ہے، لیکن جہانگیر کے زمانے میں جب ان کی مقبولیت زیادہ بڑھی تو اس وقت بھی کبھی سرزمین ہند سے ہندوؤں کی معاشرت سے ان کے

Marfat.com

رسم و رواج کو بالکل ہی پاک کر دینے کی تلقین نہیں کی، کسی مسلمان کا ہندو ہونا تو ان کیلیے بہت بڑا سانحہ ہوتا، لیکن ہندو کا ہندو رہنا ان کو کسی حال میں ناگوار نہ ہوتا، وہ اپنے مکتوب میں لکم دینکم ولی دین کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور غیر مسلم اپنے طریق (کیش) پر رہیں (مکتوب نمبر ۴۶ ج اوّل) اور اس کے بھی قائل تھے، کہ ہندوستان میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے، اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ گذشتہ امتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں پیغمبر مبعوث نہ ہوئے ہوں، اہل ہند میں بھی پیغمبر ہوئے، اور صانع جل شانہ کی طرف دعوت دی گئی، ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار اندھیروں میں مشعلوں کی طرح روشن ہیں، اگر کوئی ان شہروں کو متعین کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور ہندوستان میں جن لوگوں نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات اور اس کے تنزیہ و تقدیس کی نسبت لکھا ہے سب انوار نبوت سے مقتبس ہیں، کیونکہ گذشتہ امتوں میں ہر ایک زمانہ میں ایک نہ ایک پیغمبر ضرور گذرا ہے، جس نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات قدیمہ اور اس کے تنزیہ و تقدیس کی نسبت خبر کی ہے (مکتوب نمبر ۲۵۹ ج ۱)

اگر حضرت احمد سرہندیؒ کے بعض مکتوبات میں لینت اور نرمی کے بجائے ان کے مسلک کی شدت اور سختی کا اظہار ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری اکبر پر آتی ہے جس نے دلوں کی تسخیر دلوں کو دکھا کر کیا، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے دین الٰہی اور دوسرے اقدام سے ہندو تو اس کی طرف ضرور مائل ہو گئے، لیکن ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب تر نہ ہو سکے، بلکہ ہندو مسلمان کا جو ایک ملا جلا معاشرہ خود بخود بن رہا تھا اس کو

Marfat.com

سخت نقصان پہنچا،

بابر نے پانی پت اور کنواہا میں بڑی خونریزی کر کے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی پھر بھی اس نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرنے کی پوری کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ذات میں بڑی دلکشی تھی، وہ نشاۃ ثانیہ کے عہد کا ایک رہنما تھا، بہت ہی بہادر اور دلیر تھا، آرٹ، ادب اور خوش باشی کا دلدادہ تھا، ہمایوں نے بھی اپنی رواداری سے یہاں کے باشندوں کو اپنی طرف مائل رکھا، اور شیر شاہ کی رواداری کا راگ تو ہر زمانہ میں الاپا جائے گا، اس نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا تھا، جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کے لیے نہایت مناسب فضا مل گئی تھی، انگریز اور ہندو دونوں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ہندوستان کا پہلا حکمران ہے جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اور یہ کام اس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا کہ سیاسی اتحاد بغیر مذہبی یکسانیت کے قائم نہیں ہو سکتا، وہ تنگ نظری پسند نہ کرتا تھا، اسی لیے اس کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ صرف اس کے ہم نسل ہی اپنے کو ارکان حکومت سمجھیں، بلکہ ملک کے تمام باشندے ملک کے مشترکہ مفاد کو سامنے رکھ کر اس کے خیر خواہ رہیں، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کے لیے راستے ہموار کیے، موجودہ دور کے مورخوں میں "شیر شاہ" کے مصنف کالکارنجن قانون گو نے لکھا ہے :-

"شیر شاہ پہلا حکمران ہے جس نے مختلف مذاہب کے پیرووں کو ملا کر

Marfat.com

ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، یہ امتیاز اکبر کو دیا جاتا ہے اور شیر شاہ کے بعد یہ دعوی فضول سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ بظاہر اس نے جزیہ لینا بند نہیں کیا، گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا سنسکرت زبان کی کوئی ایسی سرپرستی نہیں کی، جس سے ہندو اور مسلمان دونوں میں کلچرل اتحاد اور علمی یگانگت پیدا ہوئی، اس نے ہندو مسلمان میں شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، اور یہ تمام باتیں اکبر کی جانب منسوب ہیں، لیکن شیر شاہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھا، اس نے علاء الدین کے چراغ کے ذریعہ ایک رات میں کوئی ہوائی قلعہ تیار کرنے کی سعی نہیں کی، بلکہ ایک ایسا جاندار اور عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جس سے ہندوؤں میں سیاسی اور اقتصادی خوشحالی خود بخود پیدا ہو گئی اس نے ہندو مسلمانوں کو متحد رہنے پر آمادہ کیا، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈالی اور اس کے لیے جتنی چیزیں ضروری تھیں، ان سب کو عمل میں لانے کی کوشش کی،"

شیر شاہ نے جو فضا پیدا کی تھی، اس کو اور بھی زیادہ خوشگوار بنانے کی ضرورت تھی، اس نے ہندو مسلمان کے اتحاد و یگانگت کی جو بنیاد ڈالی تھی، اسی کو اور مستحکم بنانا تھا، لیکن اکبر نے شیر شاہ سے علٰحدہ ایک شاہ راہ بنانے کی کوشش کی اور اس کے نتیجہ پر بحث کرتے ہوئے کالکارنجن قانون گو رقمطراز ہیں،

اگر اکبر غلط قدم نہ اٹھاتا تو ہندوستان کی قومیت سترہویں صدی عیسوی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی، اکبر نے جزیہ بند کر دیا ہوتا، یا ذبیحہ گاؤ رکوا دیا ہوتا، اپنے نظام حکومت میں ہندوؤں کو ایک حد تک شریک کر لیا ہوتا، یا سنسکرت زبان کی سرپرستی میں لگا رہتا تو یہاں تک کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن اس کے عجیب و غریب خیالات نے

Marfat.com

اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر بنا دیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمران بھی رہا، اور یہی خیالات اس کی اسکیم کی تباہی کے باعث بنے، اس نے کوئی متحدہ قوم نہیں بنائی بلکہ اس کی اسکیم سے ایسے چند مکار مسلمان اور غلامانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لیے "اللہ اکبر" لکھا کرتے تھے۔"

آگے چل کر کالکارنجن نے ایک غیر جانبدار مورخ بنکر اور تمام جذبات سے خالی ہو کر جو کچھ لکھا ہے اس کو مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے جذبات کی بھی ترجمانی سمجھنا چاہیئے، وہ لکھتے ہیں :-

"اکبر نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی، اس کو خواہ مخواہ رسوا کیا، جس کے لیے اس کی تاریخ اس کو معاف نہیں کر سکتی، اس نے جو کچھ کیا ریاست کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ایک وہم کو پورا کرنے کے لیے کیا، اسکی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق کا مرکز سمجھنے میں بالکل قاصر رہے، ہندو تو اس کی جانب مائل ہوئے، لیکن مسلمانوں کی رغبت جاتی رہی، اکبر کا اسلام سے انحراف اسکی غیر معمولی ذہانت کا اچھا نمونہ نہ تھا، اس کو اپنی نجی زندگی میں سچا مسلمان ہونا چاہیئے تھا، اگر وہ واقعی ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہاں تھا، تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہیئے تھا، لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بنا تو مسلمان اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، اس میں مسلمانوں کو نیت کا اخلاص نظر نہیں آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے، اس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ اسلام کی فلاح اسی میں سمجھنے لگے کہ گائے کا گوشت

Marfat.com

کھائیں اور ہندوؤں کی ہر چیز سے نفرت کریں، یہیں سے ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہو گیا، اگر اکبر کا جانشین دارا ہوتا تو خاندان بابری ایک بار پھر در بدر کر دیا جاتا، اکبر کے مرنے کے بعد اس کی پالیسی کا ردعمل بالآخر اورنگ زیب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دین الٰہی ہندو مسلمانوں میں جگہ نہ پا سکا، اور یہ فطری موت مر گیا، لیکن جہانگیر اور شاہجہاں کے روادارانہ اور مصالحانہ رویہ سے ہندو مسلم کا پھر ایک ملا جلا معاشرہ خود بخود پیدا ہونے لگا تھا، ضرورت تھی کہ اس میں مزید سیاسی، معاشرتی، عمرانی اور اجتماعی رواداری سے اور بھی قوت نمو پیدا کی جاتی، لیکن اکبری عہد کے تلخ تجربہ کے بعد دارا شکوہ نے ایک بار پھر ہندومت اور اسلام کو ملا کر مذہب کا ایک نیا سنگم بنانے کی کوشش کی جس سے راسخ العقیدہ مسلمان اس سے مشکوک اور بدظن ہو کر اورنگ زیب کی طرف مائل ہو گئے، اب اورنگ زیب مسلمانوں کا ہیرو بن گیا ہے، جس کو ہندو مورخین کسی حال میں بھی اچھا حکمراں کہنے کو تیار نہیں ہیں، اور وہ اس کو ہندوؤں کا بہت بڑا مخالف ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جس سے مسلمان اور مسلمان مورخین دونوں کو انکار ہے، اور یہ ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے، کہ مسلمان جس کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں اس کو ہندو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، اور ہندو جس کو اپنا ہیرو تصور کرتے ہیں اس کو مسلمان اچھا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں،

ہندو مسلمان کو ملے جلے مذہب کے ذریعہ سے ملانے کی ناکام کوشش تو برابر ہوتی رہی لیکن صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی، البیرونی اور ابوالفضل نے ہندوؤں کے مذہب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا لیکن ان کا رنگ تحقیقی اور علمی ہے، اور پھر انھوں نے کچھ ایسی مشکل زبان میں قلمبند کیا ہے کہ عام طور سے لوگ

انکو سمجھ نہ سکے، اس طرح اسلام کی خوبیاں صحیح طور پر ہندوؤں تک نہیں پہنچیں، اسی لیے دونوں ایک دوسرے کے لیے نازیبا اور نامناسب الفاظ استعمال کرتے رہے، ہندوؤں کو کافر سمجھکر بعض مسلمانوں نے ان کے لیے جو ناخوشگوار الفاظ استعمال کیے، اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کو چنڈال اور ملیچھ جیسے الفاظ سے یاد کرنے میں خوش ہوتے، اور ان کے جو جذبات مسلمانوں کے خلاف مترتب ہوتے رہے، ان کی ترجمانی موجودہ دور کے ایک بڑے مورخ آر۔ سی موزمدار کی حسب ذیل تحریر سے ہوگی،

"گیارہویں صدی کے شروع ربع میں ہندوستان کے لیے ایک بڑا المیہ پیش آیا، اور یہ المیہ ایسا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے، اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت اور انسانی قوت جاتی رہی، بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقہ سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا، جہاں سے ان کو اندرون ملک کے لیے ایک شاہراہ مل گئی، .... کچھ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو شکست دی، اور ان کی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا، ان ہی راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعوی کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں (مسلمانوں) کو نکال باہر کیا ہے، تاکہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو، اور یہ آریاؤں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اسی لیے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے ہندو راجاؤں نے اس کی ملکر کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر اپنے گوشت سے کانٹا بھی نکال پھینکتے، بہت سے مواقع آئے جب کہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا ..... لیکن طاقتور ہندوستانی راجاؤں نے ڈیڑھ صدی تک ایسے مواقع سے

فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے ہمسایہ راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرہ کی توسیع کی فکر میں لگے رہے، اور انھوں نے اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی کہ ایک غیر ملکی مذہب کے بیرونی لوگوں کی غلامی سے پنجاب کو آزاد کراتے .... (ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل جلد پنجم، تمہید از ڈاکٹر آر سی موجمدار ص ۱۷ X)

اور پھر آر۔سی۔ موزمدار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اسلام کے پیغمبر بہت ہی غیر روادار تھے، وہ اپنے زمانہ کے کسی مذہب کو روا نہیں رکھتے تھے، (ہسٹری آف انڈین پیوپل اینڈ کلچر ج ۴ ص ۵۰۴)

اور عام ہندو مورخین اس کو ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں کہ اسلام کی اسپرٹ جنگ جویانہ اور جنگ پسندانہ ہے، اسی لیے کے، ایم، منشی کی نگرانی میں جو ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل لکھی جارہی ہے، اس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان فاتحین اور سلاطین نے اپنی وحشی فوجوں کے ذریعہ سے گاؤں جلائے، غارت گری کی، لوگوں کی دولت لوٹی، برہمنوں، بچوں اور عورتوں کو قیدی بنایا، ان کو تسموں اور کچے چمڑے کے کوڑوں سے پٹوایا، قتل عام کرایا، شاندار مندروں کو منہدم کرکے ان کو جلادیا، عورتوں کی بے حرمتی کی، بازاروں میں کنیز بنا کر فروخت کیا، وہ اپنے ساتھ ایک سفری قید خانہ لیے پھرتے تھے، ان قیدیوں کو بزور زبردستی مسلمان بنا لیتے تھے،

یہ تحریریں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۷ء کی ہیں، جس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے پہلے جو انصاف پسند ہندو مورخیں کی تحقیقات ہیں، ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے،

Marfat.com

اور اب ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو ایک نئے انداز اور نئے رنگ میں پیش کیے جانے کی نئی کوشش ہو رہی ہے، جو کسی حال میں بھی ملکی مفاد کے لیے مناسب نہیں،

ہندو مسلمانوں میں جو ہم آہنگی نہ ہو سکی، اس کی بڑی وجہ ابو الفضل کے الفاظ میں یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف اور ناآشنا ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے خیالات سے لاعلم رہے، اور اس لاعلمی نے دشمنی اور مخالفت کا سنگ بنیاد رکھا، جامد تقلید کی وجہ سے عقل و دانش کی شمع گل ہو گئی اور تحقیقات کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں، اور مسائل کی تحقیق پر رد و قدح کرنا گناہ اور کفر میں داخل ہو گیا ہے، اور مہر و محبت کے ساتھ معتقدات پر تبادلۂ خیالات کرنا، اور اغیار کے چون و چرا کو حق شناسی کی ترازو میں تول کر صحیح نتیجہ پر پہنچ کر ہدایت حاصل کرنا بالکل مفقود ہو گیا، اسی لیے ہر شخص صرف اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا سمجھنے لگا، اور اغیار کو خالق مطلق کے دائرۂ بندگی سے خارج کر کے خوں ریزی اور آبرو ریزی، مردم آزاری ہی کو مذہبی فرائض میں داخل کر لیا، اور ان ہی تباہ کن افعال کو سرخروئی دارین کا وسیلہ سمجھتا رہا، ابو الفضل اپنے عقائد کے لحاظ سے بدنام ہے، لیکن اس کے یہ خیالات غور طلب ضرور ہیں،

اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے، جو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، لیکن وقتاً فوقتاً ایسے اہل دل بھی گذرتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے عقائد میں راسخ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمانوں دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیا، ان میں سب سے پہلے امیر خسرو کے بعد

نمایاں نام مرزا مظہر جانجاناں (المتوفی ۱۱۹۵ھ) کا ہے پہلے ذکر آیا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوؤں کی بت پرستی اسلام سے پہلے کے عربوں کی بت پرستی سے مختلف ہے، پھر راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے شریعت اسلام ہی کو قابل تقلید اور بقیہ تمام شریعتوں کو منسوخ سمجھتے رہے، لیکن ہندوؤں کے اوتاروں کے احترام کرنے کی یہ کہکر پوری تلقین کی ہے، کہ گذرے ہوئے لوگوں پر بغیر اس کے کہ شرع سے کفر ثابت ہو کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، مقامات مظہری میں ہے کہ ایک روز مرزا صاحب کے سامنے کسی خواب کا ذکر آیا کہ ایک صحرا ہے جس میں آگ جل رہی ہے اور کرشن اس آگ میں ہیں، اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں مرزا صاحب نے اس خواب کی تعبیر یہ بیان کی کہ صحرا کی آگ عشق ومحبت کی حرارت ہے، کرشن کی زندگی عشق ومحبت کی زندگی تھی اس لیے آگ کے اندر دکھائی دیے، اور رام کی زندگی تیاگ وایثار کی زندگی تھی، اس لیے راہ سلوک میں کنارے کھڑے نظر آئے، پھر فرمایا کہ قرآن شریف میں ہے کہ وَاِنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں بھی کوئی بشیر ونذیر ضرور آیا ہوگا، اور ممکن ہے کہ رام چندر اور کرشن ہی نبی رہے ہوں، رام چندر ابتدائی عہد میں دنیا میں بھیجے گئے جب کہ لوگوں کی عمریں دراز اور ان میں طاقت وتوانائی زیادہ ہوتی تھی، اس لیے انھوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی، کرشن اس وقت دنیا میں آئے جب عمر کوتاہ اور قوت ضعیف ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی تربیت جذبے کے مطابق کی، ان کی موسیقی اور بانسری ان کے جذب ومستی کا ثبوت ہیں، مرزا صاحب وید کو الہامی کتاب مانتے تھے، اسی لیے ہندوؤں کو اہل کتاب سمجھتے رہے،

ہندوؤں میں بھی اہل دل ایسے رہے جو اسی قسم کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً درگا داس

Marfat.com

سے اپنی کتاب مخزن الاخلاق میں لکھا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو کدورت کے زنگ سے صاف کر کے ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھے، مخالفت کے خارزار سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے اتفاق کے بوستانِ جنت نشان میں قیام کرے۔

آسایشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است   با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

وہ جب کسی مذہب کی عبادت گاہ میں پہنچے تو اس کی عزت و احترام کرے اور جب کسی مذہب کے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو تو ان کی پوری تعظیم و تکریم کرے، دینی معاملات میں کسی سے نہ الجھے اور ان بے کار جھگڑوں سے یگانگی کے تعلقات میں بیگانگی پیدا نہ ہونے دے۔

لیکن یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ایسی آوازیں ہندوستان کے باشندوں کے کانوں تک تو ضرور پہنچیں، لیکن وہ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں، ورنہ ظاہر ہے کہ کئی ہزار میل سے انگریز جیسی اجنبی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر نہ چھا جاتی،

تتمہ یہ مقالہ زیادہ طویل ہو گیا، اس میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں قلم سے بے اختیارانہ طور پر نکل آئی ہیں، جن کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن دکھانا یہ مقصود تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ان کی سیاسی مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشو و نما سلاطین، علمار اور صوفیہ کے ذریعہ سے ضرور ہوئی، لیکن پھر ان تینوں گروہوں میں جتنی ہم آہنگی ہونی چاہیے تھی، وہ نہ ہو سکی، ضرورت اس کی تھی کہ سلاطین علمار کی مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت سے پورا فائدہ اٹھاتے، اور علمار سلاطین پر تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی اقتدار کا بہتر سے بہتر مصرف

لے کر مسلمانوں کی مذہبی غیرت کا صحیح امالہ کرتے رہتے، اسی طرح اکابر صوفیہ سے وہ تعاون کرتے کیونکہ مسلمانوں میں روحانی توانائی ان ہی سے پیدا ہوتی رہی، ان سے سلاطین اور علماء دونوں کو پورا فائدہ اٹھانا چاہئے تھا، اس ہم آہنگی سے عام مسلمانوں کا ایک صالح، پائدار اور جاندار معاشرہ لازمی طور پر تیار ہو جاتا، جس سے اچھے سلاطین، اچھے امراء، اچھے علماء، اور اچھے صوفیہ بھی پیدا ہوتے رہتے، جو عام سیاست اور معاشرت کے نگہبان بن کر اسکو زوال سے بچائے رکھتے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغلوں کے آخری دور حکومت میں عام مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی بھی کھوکھلی ہو چکی تھی، ورنہ وہ خود سیاست کو سنبھال کر اس کو ایک غیر قوم کے استیلاء سے محفوظ رکھ سکتے تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پورے دور حکومت میں ایک ذہنی بحران میں مبتلا رہے، ان کا دماغ سلاطین کی طرف رہا، کیونکہ ان ہی کے ذریعہ ان کو دنیا ملتی تھی، لیکن جن کے ذریعہ ان کو دین ملتا وہ ان سلاطین کی حکومت کو فکری طور پر غیر اسلامی سمجھتے، اور پھر جن سے مسلمانوں کی روح کی جلا ہوتی، وہ یعنی صوفیہ ان دونوں سے الگ ہوتے چلے گئے، ان نظری اختلافات سے مسلمان ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور کبھی اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبان حال سے ان تینوں میں ہمنوائی اور باہمی تعاون کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور کوئی قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی جو ان میں ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر یگانگت پیدا کر دیتی، اسی لیے مسلمان کبھی بادشاہ کے ساتھ ہو جاتے، کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے اور کبھی صوفیہ کا دامن تھامتے، اس ذہنی بحران کی وجہ سے ان میں اجتماعی مقصدیت اور مرکزیت نہ پیدا ہو سکی، اور یہ برسر اقتدار اسی وقت تک رہے جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت برقرار رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور ان میں وہ کردار، بلند اخلاق اور اعلیٰ فکر و عمل نہیں رہے جن کی مدد سے حکمران کے نا اہل ہونے کے باوجود حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔

Marfat.com

اور ایک بہت ہی شاندار حکومت ختم ہو کر رہ گئی، اکبر کے زمانہ میں یہی حکومت اپنے زمانہ میں دنیا کی طاقتور ترین حکومت سمجھی جاتی تھی، اورنگ زیب کے ناقد جدو ناتھ سرکار کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہو کہ اسکے عہد میں مغلوں کی سلطنت کا رقبہ سب سے زیادہ تھا، اور ہندستان کی پوری تاریخ میں یہاں برطانوی حکومت سے پہلے کبھی اتنی بڑی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی، غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک کا پورا علاقہ ایک ایک ہی تاج و تخت کے ماتحت تھا، اور پھر دور دراز علاقوں میں لداخ اور ملابار میں بھی منبروں پر اسی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا،

لیکن یہ سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتی رہی، اس کے زوال کا الزام اورنگ زیب کے بعد کے ناکارہ حکمرانوں پر آتا ہے کہ انھوں نے جانشینی کی خونریز لڑائیاں لڑ کر حکومت کو نقصان پہنچایا، نفاق پرور، مفاد پرست اور راحت پسند امرا کو دربار میں جمع کر کے اس کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا دیا، طریقۂ جنگ میں جو ترقی ہوتی رہی اس سے وہ بالکل بے خبر رہے اور شمشیر و سنان کو چھوڑ کر طاؤس و رباب میں پڑ گئے وغیرہ،

لیکن اس زوال کی ذمہ داری علما، صلحا اور صوفیہ پر بھی عائد ہوتی ہے، وہ اچھی معاشرت بناتے رہتے تو حکومت بھی اچھی رہتی، مگر علما اچھی معاشرت بنانے کی جدوجہد کے بجائے زیادہ تر جزوی اختلافات میں مبتلا رہے، حرام و حلال کے مسائل میں وہ ایسے الجھے کہ عام لوگوں کو دین میں صرف خشکی ہی خشکی نظر آتی اور وہ اسکے دائرہ میں آسانیاں کم اور دشواریاں زیادہ پاکر اپنی زندگی کو تنگ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے، علما نے مذہب اور شریعت کی گہرائیوں کو سمجھکر غور و فکر سے کم کام لیا، انھوں نے معاملات اور اعمالِ حسنہ پر کم اور عقائد و عبادات پر زیادہ زور دیا، ان کی درسگاہوں میں تعلیمی نصاب بھی ضرورتِ زمانہ کا لحاظ کئے بغیر بالکل جامد رہا، اسی لیے وہ زیادہ تر حواشی اور تعلیقات ہی لکھنے میں مشغول رہے، اور صرف و نحو و معانی اور یونانیوں کے علوم میں کچھ ایسے ڈوبے کہ احیاءِ دین اور تجدید یقین کے لیے جس اجتہاد کی ضرورت تھی، اسکو اجتماعی

طور سے عمل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی، وہ سلاطین کی حکومت سے بدظن ہو کر خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے، لیکن اس طرز حکومت کے لیے خلافت راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علمار و صلحار کے ذریعہ ہی بن سکتی تھی، لیکن وہ صرف محراب و منبر کی زینت اور درس و تدریس کی مسند پر متمکن رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے، اور ان کی نظر سلاطین کی طرف اٹھی رہی کہ وہ اچھی حکومت کے ساتھ اچھی معاشرت بھی بنائیں، لیکن سلاطین کے ذریعہ صالح معاشرت کا بننا ممکن نہ تھا، وہ معاشرت میں حسن عجم تو پیدا کر سکتے تھے، لیکن سوز دروں عرب، علمار اور صلحار ہی کی وساطت سے پیدا ہو سکتا تھا، مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے عہد کا اتباع سنت اور زہد و تقوی کے ساتھ اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، خلق اللہ کی خدمت گزاری، مخالفین کے ساتھ حسن سلوک، مصیبت کے وقت صبر و تحمل، معاملات میں دیانت و صفائی کا پیدا کرنا، علمار ہی کے بس کا تھا، منبر پر بیٹھ کر وہ ان باتوں کی تلقین تو کرتے رہتے، لیکن ان کی دعوت میں عزیمت نہیں تھی، اسی لیے وہ مسلمانوں میں وہ سوز و مستی اور جذب و شوق پیدا نہ کر سکے، جن سے وہ صحیح معنوں میں مومن بنکر صاحب لولاک ہوتے، اور حکومت کو برائیوں سے بچا کر اس کے نگہبان و پاسبان بھی رہتے، شروع میں صوفیائے کرام نے اچھی معاشرت ضرور بنائی، لیکن آخر میں وہ بھی غیر موثر ہو گئے تھے،

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

(اقبال)

Marfat.com

مصنف کی دوسری کتابیں

بزم تیموریہ۔ تیموری بادشاہوں، شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور انکے درباری شعراء و فضلاء کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل

۴۶۴ صفحے،

بزم مملوکیہ۔ ہندوستان کے غلام سلاطین کی علم نوازی، علم پروری اور اس دور کے علماء و فضلاء کے علمی و ادبی کارنامے۔ ۳۵۰ صفحے، قیمت معہ

بزم صوفیہ۔ عہد تیموریہ سے پہلے کے اہل قلم و صاحب ملفوظات صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی سیاسی، تمدنی و معاشرتی تاریخ

۵۰۶ صفحے، قیمت عہ ۲۵ پیسہ

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

۵۰۰ صفحے، قیمت عہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

۶۵۰ صفحے، قیمت عہ

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

حصہ اول

عہد مغلیہ سے پہلے کے حکمرانوں، مذہبی رہنماؤں اور روحانی پیشواؤں کی سبق آموز کہانیاں

۲۵۴ صفحے، قیمت صہ

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

ہندوستان کے متعلق امیر خسرو کے جذبات و تاثرات و محسوسات کا دلآویز مرقع

ضخامت: ۱۳۴ صفحے

قیمت دو روپے ۷۵ پیسہ

عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

حصہ اول

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارناموں کی تفصیل

ضخامت ۵۲۶ صفحے قیمت لعہ

منیجر

Marfat.com